دربھنگا
تمثیلِ نو
سہ ماہی
صاف کر کے آئینے کی گرد کو
ڈھونڈ کر لاؤ کوئی تمثیلِ نو
ایڈیٹر
ڈاکٹر امام اعظم
Meer Zaheer Abass Rustmani

تمثیلِ نو ایک معتبر جریدہ
۹۸۰ + ۵۶ + ۳۱ + ۱۲ + ۷۱۲ + ۲۲۲ = ۲۰۰۱

جدید تر شعری و ادبی رجحانات کا ترجمان

سہ ماہی ''تمثیل نو'' دربھنگہ

شمارہ: ۱۰	جولائی تا ستمبر ۲۰۰۳ء	جلد: ۳

زرتعاون

فی شمارہ: ۱۵ روپے، سالانہ: ۱۰۰ روپے، خصوصی تعاون: ۳۰۰ روپے، تاحیات (بھارت): ۳۰۰۰ روپے
پاکستان و بنگلہ دیش (سالانہ): ۲۰۰ روپے، دیگر ممالک (سالانہ): ۱۵ امریکی ڈالر / پونڈ

رابطہ: ''تمثیلِ نو'' قلعہ گھاٹ، دربھنگا ۸۴۶۰۰۴ (بہار)۔ فون: ۲۳۵۱۱۷-۰۶۲۷۲

email-imamazam@epatra.com

''تمثیلِ نو'' سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حق سماعت صرف دربھنگا کی عدلیہ میں ہوگا۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر و آنر ڈاکٹر امام اعظم نے ایم۔ آر آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی ۔۲ سے چھپوا کر
دفتر ''تمثیلِ نو'' اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، دربھنگا ۴ سے شائع کیا۔

کمپوزنگ: اقراء گرافکس، پانی ٹنکی، لال باغ، دربھنگہ

ترتیب

مجھے کچھ کہنا ہے......!

''تمثیل نو'' کا دسواں شمارہ بروقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ رسالہ پورے آب وتاب کے ساتھ اپنی تیسری بہار میں داخل ہوکر قارئین کرام کے دل ودماغ کو معطر اوران کے ادبی ذوق کی تسکین کررہا ہے۔ آج کے دنوں میں کسی ادبی جریدہ کا اجرا اوراس کی بقا کا مسئلہ کتنا سنگین ہے اس سے ہر باذوق قاری اور ادب نواز واقف ہے۔ اپنی کم مائیگی اور باضابطہ کسی ذریعۂ آمدنی کے بغیر مخصوص احباب کے تعاون اور مختصر اشتہارات کے سہارے، ہم جس طرح آپ تک یہ رسالہ پہنچارہے ہیں وہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

آزاد ہندوستان میں اُردو کی ترویج واشاعت سے کہیں بڑھ کر اب اس کی بقا کا مسئلہ درپیش ہے۔ اردو کے نام پر سرکاری اعانت نہ تو تشفی بخش ہے اور نہ ہی اس کا اہتمام صحیح ڈھنگ سے ہورہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے مسائل دنوں دن زیادہ پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں۔ یہ تو خیر منائیے کہ اُردو اپنی سخت جانی اور بنیادی حُسن ولطافت کی وجہ سے زندہ ہے، ورنہ اس کے نام نہاد پرستاروں نے کب کا اسے زندہ درگور کردیا ہوتا۔ اُردو ایک عوامی زبان ہے، ایک رابطے کی زبان ہے اور یہی اس کی بقا کا ضامن بھی ہے۔

اُردو اگر ایک طرف اپنے عام فہم اور مقبول نغموں کے ذریعہ فلمستان سے نکل کر ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل گئی ہے، اس کا جادو اس کے دشمنوں کے سر پر بھی چڑھ کر بولتا ہے تو دوسری طرف دینی مدارس کے طلبا واساتذہ کے ذریعہ عوام وخواص تک پہنچ رہی ہے۔ سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس کی حالت دگرگوں ہے۔ اردو اپنی فطری مقبولیت کی وجہ سے زندہ ہے۔ نام نہاد ''اُردو ڈے'' کی بیساکھی کے سہارے چل کر یہ لنگڑی نہیں ہونا چاہتی اور نہ ہی ''یومِ اُردو'' کے جلسوں میں اُردو کی لطیف ونازک گردن میں پھولوں کی مالائیں ڈال کر اسے بونا کیا جاسکتا ہے۔ سستی شہرت، جھوٹے نام ونمود اور ادبی سیاست سے الگ ہٹ کر ہم نے ''تمثیل نو'' کے اوراق کے ذریعہ ہر ذوق کے قارئین کرام کے لئے مواد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''تمثیل نو'' کے ہر شمارہ میں قارئین کی گراں قدر آرا ہمارے دعوے کا ثبوت ہیں۔ اُردو سے سچی ہمدردی یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں میں اُردو کے چلن کو عام کریں اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس کا استعمال کرکے گردوپیش کے ماحول کو متاثر کریں۔ اُردو کے اخبارات ورسائل خرید کر اس کو استقامت عطا کریں اور اپنے بچوں کی زبان اور تلفظ پر توجہ مبذول کرتے ہوئے ابتدائی دنوں میں ہی اس کی اصلاح کردیں۔ یہ کام ان محترم مولویوں کے ذریعہ بہتر طریقہ سے بخیر وخوبی انجام دیا جاسکتا ہے جو بچوں کے اتالیق ہیں اگر آپ اپنے گھروں میں بنیادی دینی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں۔ آج یہ بات اور بھی زیادہ اہم ہوگئی ہے کیوں کہ نیچے سے اوپر تک ہر جگہ آپ کی زبان، آپ کا مذہب اور آپ کے تشخص کی بیخ کنی کی سیاست کی جارہی ہے۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم اگلے شمارہ سے ایک نیا کالم ''ادبی پوسٹ مارٹم'' شروع کرنے

جارہے ہیں۔ حقانی القاسمی (نئی دہلی/ارریہ) کا یہ کالم ادب کی موجودہ صورت حال اور ادبی بدعنوانیوں پر محیط ہوگا۔ اُمید ہے کہ قارئین کو یہ نیا سلسلہ پسند آئے گا!

❁ ایک گذارش: نوآموز شعراء کرام کسی استاد شاعر سے اپنے کلام پر اصلاح لے کر "تمثیل نو" میں اشاعت کیلئے ارسال کریں اور اگر کہنہ مشق ہیں تو اشاعت میں بھیجنے سے پہلے براہ کرم نظر ثانی کرلیا کریں۔

ادبی وثقافتی پروگرام:

☆ "بزمِ اُردو" دربھنگہ کی پہلی نشست دھنباد سے تشریف لائے سہ ماہی "وقت" کے مدیر، معتبر افسانہ نگار پروفیسر سید منظر امام کے اعزاز میں "امیر منزل" قلعہ گھاٹ میں مورخہ ۲۹ رمئی ۲۰۰۳ء کو زیر صدارت مولانا صابر حسین القاسمی مدنی (پرنسپل، مدرسہ امدادیہ، لہریاسرائے) منعقد ہوئی جس کی نظامت تسکین اعظمی نے کی۔ پروفیسر شاکر خلیق نے پروفیسر سید منظر امام اور "امیر منزل" کی ادبی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ وہی "امیر منزل" ہے جس کے درو دیوار سے بزرگ شاعر جناب حسن امام درد اور بین الاقوامی شاعر اور آزاد غزل کے موجد جناب مظہر امام کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے۔ اسی "امیر منزل" سے ۱۹۴۹ء میں جناب مظہر امام اور جناب منظر شہاب کے اشتراک سے "نئی کرن" کا اجرا ہوا اور ۱۹۶۰ء میں جناب سید منظر امام نے رسالہ "رفتارِ نو" جاری کیا تھا۔ انہوں نے جمشید پور سے بھی ایک رسالہ "ترسیل" نکالا۔ ادھر تقریباً ۳ برسوں سے دھنباد سے "وقت" نکال رہے ہیں۔ پروفیسر موصوف کے ان کلمات کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ جن شعراء نے اپنے کلام سے نوازا ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر عبدالمنان طرزی، ڈاکٹر نور محمد عاجز، ڈاکٹر منصور عمر، سیف رحمانی، ڈاکٹر امام اعظم، جمال اویسی، عرفان احمد بیدل، ڈاکٹر سید ندیم کمال، ڈاکٹر رضوان حیدر، شاہ محمد نسیم، حسن امام درد۔ اس خوبصورت بزم میں جن لوگوں نے شرکت فرمائی ان میں آچاریہ شوکت خلیل، پروفیسر اے اے ہلال، اشرف اعظم، ادریس پرویز ایڈوکیٹ، انجینئر محمد صالح، شوکت احمد یحییٰ، انجینئر ولی احمد، افلاک منظر، ایم۔ خوشتر، امام فاروقی، سید متین اشرف، شکیل احمد سلفی، ڈاکٹر شاہد ظفر، عطاء الرحمٰن رضوی، مظہر حسین، بدر عالم، پروفیسر ابصار الحق، ڈاکٹر مزمل حسن آرزو، پروفیسر شاہد حسن، رضی احمد، ڈاکٹر اجیر الحق وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

☆ "بزمِ اُردو" اور "ملت لائبریری" قلعہ گھاٹ کے زیر اہتمام ۱۱ رجون ۲۰۰۳ء کو یوم اُردو کے موقعہ پر سی ایم کالج کے احاطہ میں ایک ادبی وثقافتی پروگرام منعقد کیا گیا جس کی صدارت معروف سماجی کارکن پروفیسر دیوی دت پودّار نے کی اور بطور مہمان خصوصی جناب ایس۔ ایم۔ اشرف فرید (چیف ایڈیٹر "قومی تنظیم" پٹنہ) رونق افروزِ بزم ہوئے۔ جلسہ کا باضابطہ آغاز "حمد پاک" سے ہوا جسے خوش گلوفن کار شاہ معین احمد نے پیش کیا۔ اس موقعہ پر پروفیسر شاکر خلیق، ڈاکٹر شمیم باروی، جناب نیاز احمد (سابق

اے ڈی ایم)، ڈاکٹر عبدالعزیز سلفی، مولانا صابر حسین القاسمی مدنی، آچاریہ شوکت خلیل، عطاء الرحمن رضوی، حیدر وارثی، ڈاکٹر منصور عمر نے اُردو کے مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس کے بعد مہمان خصوصی جناب اشرف فرید نے فرمایا کہ اُردو کو صرف مینا بازار کی طرح سجانے سے کام نہیں چلے گا بلکہ اس کی سچی محبت تو اس بات میں ہے کہ اس کی ترویج واشاعت پر محنت کی جائے اور اسے گھر گھر پہنچانے کا کام کیا جائے۔ ہر زبان والے اپنی مادری زبان سے محبت کرتے ہیں۔ صدر بزم پروفیسر دیوی دت پودار نے کہا کہ اُردو کو مسلمانوں کے ساتھ جوڑنا بڑی ناانصافی ہے۔ بھاشا کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس کے بعد مختلف لوگوں کی ادبی، ملی، سیاسی، خدمات کے اعتراف میں کئی ایوارڈز پیش کئے گئے۔ مولانا مقبول احمد خاںؒ ایوارڈ بزرگ شاعر حسن امام درد کو پروفیسر سید اجتبیٰ حسین رضوی ایوارڈ پروفیسر شاکر خلیق کو، محمد شفیع بیرسٹر ایوارڈ سابق ایم ایل سی جناب فدا حسین انصاری کو، ڈاکٹر محمد فریدؒ ایوارڈ بزرگ شاعر اور محقق شاداں فاروقی کو، حاجی وراثت حسینؒ ایوارڈ پروفیسر دیوی دت پودار کو، ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ نواب ایوارڈ ڈاکٹر راج شیکھر سریواستو کو، ایس۔ ایم۔ زبیر ایوارڈ آئی۔ آر۔ کمل ایڈوکیٹ کو، محسن دربھنگوی ایوارڈ معروف ترقی پسند شاعر اویس احمد دوراں کو اور اقراء اکیڈمی ایوارڈ نوجوان ڈاکٹر شمیم خرم اعظمی کو دئے گئے۔ اس کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا جس کی نظامت ڈاکٹر شمیم باروی نے کی۔ انہوں نے جن شعراء کو مائک پر بلایا ان کے نام اس طرح ہیں: پروفیسر شاکر خلیق، حسن امام درد، نیاز احمد، ڈاکٹر منصور عمر، ڈاکٹر امام اعظم، حیدر وارثی، عرفان احمد پیدل، سید ندیم کمال، ڈاکٹر شمیم باروی۔ اس پروگرام میں جن لوگوں نے شرکت کی ان میں ڈاکٹر سید عبدالحکیم مظفر، ڈاکٹر سید احتشام الدین، ادریس پرویز ایڈوکیٹ، ڈاکٹر اعجاز احمد، ڈاکٹر افتخار احمد، عبیدالرحمٰن، نسیم احمد دلارے، طفیل احمد فاروقی، انجینئر انور امام، ڈاکٹر اجیرالحق، ڈاکٹر رضی احمد، ظہیرالحق (اوڈیٹر)، سید متین اشرف، ایم۔ خوشتر وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ پروگرام کے کنوینر تسکین اعظمی اور بزم اُردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر سید ندیم کمال نے مشترکہ طور سے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اس کے بعد پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

☆ ''ادبی چوپال'' کی ایک نشست ماسٹر شوکت علی صاحب کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ اس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ش۔ ڈمروی نے شرکت کی اور کہا کہ جو لوگ اُردو کے نام پر روٹی توڑ رہے ہیں وہی اُردو کے خلاف سازش کر رہے ہیں، جنہیں اُردو زبان وادب کی کوئی واقفیت نہیں ہے وہی اُردو کی انجمنیں کیڑے مکوڑوں کی طرح قائم کر رہے ہیں۔ عرفان احمد پیدل نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اُردو اپنے گھر میں ہی سیاست کی شکار ہے۔ اس میٹنگ سے جن لوگوں نے خطاب کیا ان میں عبدالہادی صدیقی اسد احمد، شوکت علی، نورالرحمٰن نور، امجد امام حنا کے نام اہم ہیں۔ اس کی نظامت ایم۔ خوشتر نے کی۔

☆ جناب محمد ابوظفر صاحب بھیریاہی کی صدارت میں ''ادبی پارلیامنٹ'' کی گذشتہ دنوں ایک خصوصی نشست ہوئی۔ جس کی نظامت ''اقراء گرافکس'' لال باغ (دربھنگہ) کے ماہر کمپوزر اور نوجوان فن کار

نظر عالم نے کی۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب سلطان شمسی نے شرکت کی اور کہا کہ اُردو جو اپنے گھر میں سیاست کی شکار ہے اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اپنے گھروں میں اُردو کو زندہ رکھیں ورنہ ہماری شناخت ختم ہو جائے گی۔ اس موقعہ سے جاوید احمد نے کہا کہ اُردو ایک تہذیب کا نام ہے اور پرنس عرفات حسنین نے کہا کہ اُردو کو نقصان صرف اپنوں سے ہے غیروں سے نہیں۔ صدر کی اجازت سے تنویر احمد نے تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا اور محفل اختتام پذیر ہوئی۔

کچھ اہم خبریں:

☆ معروف محقق، ناقد اور دانشور پروفیسر عبدالواسع، (سابق صدر شعبۂ اُردو، بہار یونیورسٹی مظفر پور) کو یو۔جی۔سی کے ذریعہ پروفیسر امیرٹیس بنایا گیا ہے۔ ''اُردو ناول میں دلت شعور'' پر کام کرنے کے لئے انہیں ۲ سال کی مدت کے لئے یہ اعزاز بخشا گیا ہے۔

☆ اُردو کے منفرد فکشن رائٹر، ممتاز شاعر اور سہ ماہی ''استعارہ'' کے مدیر صلاح الدین پرویز کو سال رواں کے لئے دوحہ قطر کا ''فروغِ اُردو ادب'' ایوارڈ دیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی تمغہ اور سپاس نامے پر مشتمل ہے۔

☆ حکومت امریکہ نے اپنے ملک میں موجودہ صورت حال کے جائزہ کے لئے ہندوستان کے ۲ روزناموں کا انتخاب کیا ہے جن میں ایک ''اردو ٹائمز'' ممبئی اور دوسرا ''بزنس اسٹینڈرڈ''۔ ''اُردو ٹائمز'' کے دہلی بیورو کے ذمہ دار جناب اے۔ یو۔ آصف (خلف داروغہ عبدالحیٰ مرحوم، چک رحمت بھیگو، دربھنگہ، بہار) ۲۶ رجولائی کو اس اہم خصوصی مشن پر امریکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

☆ برطانیہ میں مقیم معروف شاعر گلشن کھنہ کی اپنے وطن چنڈی گڑھ آمد پر ان کے تیسرے شعری مجموعہ ''سوچ کی خوشبو'' کی رسم اجراء پنجاب یونیورسٹی کے کیمپس کے ایک ہال میں مستند افسانہ نگار اور شاعر کشمیری لال ذاکر کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ نظامت کے فرائض اُردو کے نامور شاعر ڈاکٹر شباب للت نے انجام دئے۔ گلشن کھنہ کے اس مجموعہ کی روشنی میں ڈاکٹر رینو بہل، کرشن کمار طور، ڈاکٹر سیفی سرونجی، ناصر دہلوی، آر۔ ڈی۔ شرما، سلطان انجم وغیرہ نے ان کی شاعری پر بھرپور روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ایک خوبصورت بزم بھی سجائی گئی۔

☆ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کے چیرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم کے مطابق گذشتہ دنوں جامعہ ہمدرد کے کنونشن سنٹر میں ممتاز ماہر اقتصادیات ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی کو تیسرا شاہ ولی اللہ ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس سے قبل یہ ایوارڈ مولانا علی میاں ندویؒ اور قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کو پیش کیا جا چکا ہے۔ ایک لاکھ نقد اور میمنٹو دئے گئے۔ اس تقریب کی صدارت سابق چیف جسٹس آف انڈیا جناب اے ایم احمدی نے کی۔

☆ اُردو کے ممتاز شاعر جناب شمیم فاروقی آکاشوانی پٹنہ کے ڈائرکٹر بنائے گئے ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اسی آکاشوانی میں پروگرام اکزیکیٹو (اُردو سکشن) کے عہدہ پر معروف شاعر

کمال جعفری بہت پہلے جوائن کر چکے ہیں۔

☆ انجمن فروغ اُردو کی جانب سے ۲۴ مئی ۲۰۰۳ء کو ومبلڈن کمیونٹی سنٹر امریکہ میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ صدر انجمن جناب فاروق حیدر نے سامعین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ نئی نسل میں اُردو کی ترویج وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کی نظامت ابراہیم رضوی نے کی۔ انہوں نے اس کے بانی اور معتمد جناب عباس زیدی کو دعوت دی کہ وہ اپنے خیالات پیش کریں۔ انہوں نے کہا کہ بچوں میں اُردو زبان سے دلچسپی پیدا کرنی ہوگی۔ اب انجمن کے معتمد جناب فہیم اختر نے اپنی رپورٹ پیش کی اور بتایا کہ اس انجمن کا یہ تیسرا جلسہ ہے۔ معروف افسانہ نگار امجد مرزا نے اپنا افسانہ ''فیصلہ'' پیش کیا، جو کافی پسند کیا گیا۔ پھر جناب رفعت شمیم نے ایک ڈرامہ ''کل دیکھیں گے'' پیش کیا۔ اس ڈرامہ سے سامعین بہت لطف اندوز ہوئے اس کے بعد محفل مشاعرہ کا آغاز جناب ابراہیم رضوی نے کیا اور صدارت جناب شیام رستوگی عارف نے کی۔ جن شعرائے کرام نے مشاعرہ میں شرکت کی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: محمود علی، رحیم اللہ شاد، نصیر احمد ناصر، ریاست عباس رضوی، ڈاکٹر جمال سوری، سیما جبار، ابراہیم رضوی، فاروق حیدر ناداں، اعجاز احمد اعجاز، سلطان صابری، اشفاق حسین اشفاق، ڈاکٹر ہلال فرید، فیاض عادل فاروقی، رفعت شمیم، امجد مرزا، ڈاکٹر عبدالغفار عزم، شیام عارف رستوگی۔ اخیر میں جناب فہیم اختر نے جناب خورشید عالم کا تعارف ہیلتھ اتھوریٹی کا کمشنر مقرر ہونے پر کرایا اور جناب ظفر احمد نے گلدستہ پیش کیا۔

☆ اُردو کے معروف افسانہ نگار احمد صغیر کو اس سال ساہتیہ اکاڈمی کا ٹریول گرانٹ ملا ہے اس کے تحت کسی مصنف کو ۱۰ ہزار روپے ساہتیہ اکاڈمی دیتی ہے تاکہ وہ کسی تاریخی شہر کا سفر کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرے اور وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات بھی کر سکے۔ موصوف ان دنوں دہلی میں اسکرپٹ رائٹنگ میں مصروف ہیں نیز ''استعارہ'' سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔

☆ ہمدرد پبلک اسکول تعلیم آباد سنگم وہار، دہلی میں مورخہ ۱۸ مئی ۲۰۰۳ء کو رینبو سمر کیمپ زیر اہتمام النور ویمنس ویلفیئر آرگنائزیشن، دہلی اور زیر صدارت جناب سید حامد (چانسلر، ہمدرد یونیورسٹی) آغاز ہوا۔ مہمان خصوصی جناب مولانا محمد اسلم (مہتمم دارالعلوم دیوبند) تھے۔ جناب اسلم پرویز، مسز لتا میتھیو (پرنسپل، ہمدرد پبلک اسکول)، ایڈوکیٹ پترا صاحب نے اس تقریب میں اظہار خیال فرمایا۔ محترمہ ریحانہ صدیقی (آرگنائزر سمر کیمپ) نے طلبہ وطالبات واساتذہ اور مہمان کا استقبال کیا۔ محترمہ حلیمہ سعدیہ (سکریٹری) نے کیمپ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کیمپ میں داخل نوجوان طلبہ کو زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھنے کی ترغیب دی۔ جن معزز اساتذہ نے بچوں کی تدریس اور افہام وتفہیم پر اظہار خیال فرمایا ان میں ڈاکٹر اسلم پرویز، محترمہ حلیمہ سعدیہ، جناب سید حسن کمال ندوی، محترمہ امیہ کاشکلا، محترمہ نسیمہ خان، محترمہ یاسمین، ڈاکٹر ظفر الاسلام، جناب امان اللہ فہد، جناب محمد اشفاق احمد، جناب اعجاز اسلم، محترمہ صدیقہ جمال، کرنل سید محمد اختر، جناب طارق عبداللہ، جناب محمد خالد، مسز نایاب صاحبہ، جناب

انس، محترمہ ممدوحہ صاحبہ قابل ذکر ہیں۔ ۲۳ رمئی کو اختتامی تقریب کی صدارت بھی جناب سید حامد نے فرمائی۔ اس موقعہ پر جناب طاہر محمود (سابق چیئر مین اقلیتی کمیشن) بطور مہمان خصوصی تشریف فرما تھے۔ مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے ڈاکٹر جے سی بترا، محترمہ لتا میتھیوز صاحبہ اور جناب اسرارالحق قاسمی نے اپنے اظہار خیالات میں سمر کیمپ کی کامیابی پر النور ویمنس ویلفیئر آرگنائزیشن کو دلی مبارکباد پیش کی۔ مقررین نے بچوں کے گوناگوں پروگراموں، ان کی مشغولیات، تعلیمات، مقابلوں، تفریحات وغیرہ کو بہت مفید اور کارآمد قرار دیا۔ آخر میں مولانا اسرارالحق قاسمی کی دعاء پر ان تقریبات کا اختتام ہوا۔

ادارہ ان تمام حضرات کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہے!

وفیات:

☆ مشہور جدید شاعر ڈاکٹر اسعد بدایونی کا انتقال ۵ رمارچ ۲۰۰۳ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے علی گڑھ میں ہوگیا۔ جنازہ علی گڑھ سے بدایوں لے جایا گیا جہاں ۶ رمارچ کو تدفین عمل میں آئی۔ ان کی ولادت ۳ راگست ۱۹۵۷ء کو اپنے ننہال قصبہ سہوان ضلع بدایوں میں ہوئی۔ تعلیمی اسناد میں ان کی تاریخ پیدائش ۲۵ رفروری ۱۹۵۸ء درج ہے۔ مرحوم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ تھے۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ بڑے ہی ملنسار اور باغ و بہار انسان تھے۔

☆ مشہور عالم دین، شیریں بیان مقرر و خطیب حضرت الحاج مولانا محمد تسلیم رحمانی کا اپنے آبائی گاؤں سدھولی دربھنگہ میں ۳۰ رمارچ ۲۰۰۳ء کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً ۷۲ سال تھی۔ وہ عرصہ سے جامعہ رحمانی مونگیر کے نائب ناظم، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تاسیسی رکن اور بہار کے متعدد اداروں کے نگراں و سربراہ تھے۔ مولانا نہایت ہی خلیق اور ملنسار تھے۔ ساتویں دہائی میں وہ مدرسہ امدادیہ لہیریا سرائے میں مہتمم تھے۔ حضرت مولاناؒ سے ہماری بھی قرابت داری تھی۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین)

☆ اُردو کے مشہور شاعر امیر قزلباش کا ۲۵ رمئی ۲۰۰۳ء کو طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ آپ ۱۵ رجنوری ۱۹۴۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ مشاعروں کے بڑے ہی مقبول شاعر تھے۔ ان کے چار شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ انہوں نے کئی فلموں کے لئے گیت بھی لکھے جن میں ''پریم روگ''، ''رام تیری گنگا میلی''، ''حنا'' وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ نیز دوردرشن کیلئے کئی اہم سیریلیں بھی بنائے۔ مشاعروں کے کافی مقبول شاعر تھے۔

☆ اُردو کے ممتاز شاعر کرشن بہاری نور کا انتقال ۳۰ رمئی ۲۰۰۳ء کو ہوگیا۔ وہ تقریباً ۷۷ برس کے تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''دکھ سکھ'' اور ''تپسیا'' شائع ہوچکے ہیں۔ آنجہانی بین الاقوامی مشاعروں میں کافی مقبول تھے۔ بڑے ہی سنجیدہ اور متین تھے اور ان کی شاعری میں کلاسیکی رچاؤ تھا۔

☆ بزرگ شاعر اور صحافی وفا ملک پوری کا طویل علالت کے بعد ۴ رجون ۲۰۰۳ء کو پورنیہ میں انتقال ہوگیا۔ ان کا اصل نام سید عباس علی تھا اور ان کی ولادت اگست ۱۹۲۳ء کو ملک پور دربھنگہ میں ہوئی۔ وفا

صاحب کا ادبی سفر بڑا طویل رہا اور اس درمیان انہوں نے پورنیہ سے ۱۹۵۲ء میں ایک ادبی رسالہ ''صبحِ نو'' کا اجرا کیا۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۵ء تک یہ پٹنہ سے شائع ہوا۔ ''صبحِ نو'' کے تین عظیم الشان نمبر نکلے ''علی عباس حسینی نمبر''، ''اختر قادری نمبر اور ''سید نذر امام نمبر''۔ ان کے انتقال کی اطلاع خاکسار کو ان کے ایک مقرب کہنہ مشق شاعر اور ''اپنا مرثیہ'' کے خالق ذکی احمد چندن پٹوی بذریعہ فون دی۔ میں بچپن سے اپنے گھر میں ''صبحِ نو'' دیکھتا تھا۔ میرے والد بزرگوار اس رسالہ کا مطالعہ بڑی ہی پابندی سے کرتے تھے۔ وفا صاحب کی علالت کی اطلاع پروفیسر جابر حسین صاحب (چیئرمین، ودھان پریشد، پٹنہ) کو ۵ رمئی ۲۰۰۳ء کو صبح سلی گوڑی سے ملی۔ اس کے فوراً ہی بعد انہوں نے قانون ساز کونسل کے سکریٹری کو ہدایت دی کہ ''کلاندھی'' سے فوری طور پر ۲۵ رہزار روپے کی مدد دی جائے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''حرف وفا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

☆ اُردو کے معروف ادیب دانشور اور شاعر ڈاکٹر ابوالفیض سحر کا ۲۲ رجون کی شب انتقال ہوگیا۔ ۲۳ رجون کو وہ سپردِ خاک کئے گئے۔ ان کی پیدائش ۹ رفروری ۱۹۳۷ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔ آپ دہلی میں حیدرآبادی تہذیب کے نمائندہ تھے۔ ان کی کئی کتابیں ہیں۔ وہ ادب اور فن کار کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ناظم بھی تھے۔

☆ اُردو، ہندی اور پنجابی معروف و مقتدر افسانہ نگار اور ناول نگار بھیشم ساہنی کا انتقال ۱۱ رجولائی کو دماغ کی نسیں پھٹنے سے دہلی کے اسکورٹس ہارٹ انسٹی ٹیوٹ میں ہوگیا۔ ان کی پیدائش ۱۸ راگست 1915 کو راول پنڈی (پاکستان) میں ہوئی۔ ممتاز فلمی اداکار آنجہانی بلراج ساہنی کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ پوری زندگی ادب و ثقافت کی خدمت میں لگے رہے۔ ۱۹۵۷ء۔۱۹۶۳ء کے درمیان ماسکو میں غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر میں بطور مترجم کام کیا۔ تقسیم پر ان کے ناول ''تمس'' کو ۱۹۷۵ء میں ساہتیہ اکیڈمی کا انعام بھی دیا گیا اور ٹی وی سیریل ''تمس'' کو کافی شہرت و مقبولیت بھی ملی تھی۔ ان کی تخلیقات میں ہندوپاک کی تقسیم کا درد شدومد سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی تحریر میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے پیغام کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ادارہ ان حضرات کی وفات حسرتِ آیات پر رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے مغفرت کی دعا کرتا ہے!

--------- امام اعظم

ڈاکٹر حافظ عبدالمنان طرزیؔ، دربھنگہ

قطعاتِ تاریخ بروفاتِ مشاہیرِ ادب

اسعد بدایونی

زخم کھاتے رہے، مسکراتے رہے
زندگی کو سبق وہ سکھاتے رہے
جو دکھاتے رہے اپنے فن کے ہنر
اب وہ اسعد بدایونی جاتے رہے
+۱۱۴۲
۸۶۱=۲۰۰۳ء

مولانا محمد تسلیم سِدھولوی

عاقبت اندیش رکھتے اس حقیقت پر نظر
ہر کسی کو ایک دن کرنا پڑے گا یہ سفر
عمر بھر تبلیغِ دینِ مصطفیٰ کرتے رہے
مولوی تسلیم ہائے اک خطیبِ معتبر
۲۰۰۳ء

امیر قزلباش

بڑی روح فرسا خبر یہ سنی
جہاں سے اہم شخصیت اک گئی
جسے کہئے بھی اُردو کی آبرو
امیرِ سخن وہ قزلباش ہی
+۵۷۶
۱۴۲۷=۲۰۰۳ء

کرشن بہاری نور

ہے نہ وہ رنگِ گلستاں اور نہیں بوئے چمن
ہے نہ وہ کیفِ غزل، حسن ادا، خوبیٔ فن
لُٹ گیا فکر و نظر کا آج اک گنجِ گراں
خالی کردی نور نے اب دیکھئے بزمِ سخن
۲۰۰۳ء

وفا ملک پوری

کیوں بے اثر بتائے ساری دوا گئی
بیکار اُن کے حق میں ہے اپنی دعا گئی
کہئے وہ زندگی ہی کا کوئی فریب اک
تاریکیوں میں موت کی ''صبحِ وفا'' گئی
+۵۲۳
۱۴۸۰=۲۰۰۳ء

ابوالفیض سحر

ٹی۔وی۔ کیسی خبر لائی بھی دوستو
رنج و غم کی گھڑی چھائی بھی دوستو
اب نہ محفل، نہ شاعر، نہ سامع کوئی
شامِ فیضِ سحر آئی بھی دوستو
۲۰۰۳ء

بھیشم ساہنی

جو ناول یا افسانہ لکھتا رہا
وہ فنکار قصہ ہے خود بن گیا
جہاں سے تو وہ بھشم اب جاچکے
''تمس'' جانشیں ایک اُن کا بنا
+۹۳۳
۱۰۷۰=۲۰۰۳ء

ڈاکٹر ظفر حمیدی، مظفر پور

حمد باری تعالیٰ

متاعِ عاشقاں اللہ اکبر
حریمِ قدسیاں اللہ اکبر
ازل سے تا ابد جاری رہے گا
حیاتِ جاوداں اللہ اکبر
انہیں بھی کاش یہ احساس ہوتا
ادائے دلبراں اللہ اکبر
طبق پر اک طبق کی تابناکی
ہے نورِ دو جہاں اللہ اکبر
جمالِ رب کے پرتو کا نمونہ
حسینانِ زماں اللہ اکبر
یہ فطرت میں تنوع کا تموج
صفاتِ بیکراں اللہ اکبر
کوئی تمثیل ممکن ہی نہیں ہے
عجب عجزِ بیاں اللہ اکبر
''انا'' کیا ہے، انا ہے، بس انا ہے
''انا'' کا رازداں اللہ اکبر
لطیف انداز میں خوشبو کو سونگھیں
ہے خوشبو کی زباں اللہ اکبر
ہے رنگوں کی نمائش اک کرشمہ
ہے بے رنگی کی جاں اللہ اکبر
مکانوں کے ہجوم مستقل ہیں
فقط ہے لامکاں اللہ اکبر
بصیرت کی نگہ سے دیکھ لیں گے
خودی میں ضوفشاں اللہ اکبر
ترنم کی ہم آہنگی میں رقصاں
ہے موجِ تارِ جاں اللہ اکبر
مری تسبیح، آہِ صبح گاہی
ہے وردِ کہکشاں اللہ اکبر
الوہیت کی سچائی تجلّی
زمیں تا آسماں اللہ اکبر
ظفر کو خود پتہ چلتا نہیں
ہے کتنا مہرباں اللہ اکبر

نجم عثمانی، دھنباد

نعت پاکؐ

تجلّیٔ رُخ صد طور ہوگئی دنیا
وہ آئے نور سے معمور ہوگئی دنیا
کھڑے تھے دست بریدہ خدائے ظلم و ستم
غم و الم سے بہت دُور ہوگئی دنیا
بنائے ناز ہوا رشکِ حسنِ حد یوسف
جمالِ جسم پہ مغرور ہوگئی دنیا
صدائے حق سے فضا گونج اٹھی زمانے کی
اندھیرے چھٹ گئے پُرنور ہوگئی دنیا
ہے ان کے نام کا چرچا تمام عالم میں
قدم کے فیض سے مشہور ہوگئی دنیا
لٹا رہے تھے وہ پیمانۂ مئے توحید
اُٹھی نگاہ کہ مخمور ہوگئی دنیا
وہ ان کی سیرتِ معجز نما وہ طرزِ سخن
وہ سحر کیا تھا کہ مسحور ہوگئی دنیا
ذلیل و خوار ہوئے ان کی راہ چھوڑ کے ہم
یہ بے سبب نہیں مقہور ہوگئی دنیا
ہے اہلِ عشق کے وردِ زباں درود و سلام
اس ایک کام پہ مامور ہوگئی دنیا

ڈاکٹر ایم۔نہال، دربھنگہ

کچھ یادیں کچھ باتیں

مذکورہ تفصیل ۳اپریل ۱۹۹۰ کو ہوٹل ہولی ڈے ان (کراؤن پلازا) نئی دہلی میں منعقد یک روزہ Raelian Movement کے پرگرام کی ہے۔موضوع تھا Rael نام کا ایک سابق فرانسیسی صحافی جسے خودساختہ دعوے کے مطابق دوسرے سیارہ کے لوگوں نے اپنے پاس بلایا تھا اور زمین پر انسان سمیت تمام جانداروں کے خالق (نعوذ باللہ) Elohim سے ملاقات کروائی تھی۔اس انتہائی غیر معمولی Meet کا اشتہار دہلی کے تمام اخبارات میں کئی روز تک آتا رہا تھا۔ اور یوم مقررہ کو پانچ ہزار سے زائد Intellectuals نے اسے Attend کیا تھا۔بصد جستجو میں بھی اپنے بڑے بھائی اے یو آصف نئی دہلی اور ڈاکٹر چودھری شرف الدین پٹنہ یونی ورسیٹی کے ساتھ وہاں گیا تھا۔پیش ہیں قارئین کی دلچسپی کے لئے اسی پرگرام کے چند حصے:(رائل کی گفتگو فرانسیسی زبان میں تھی جسے کچھ فوٹو، ہاتھ سے بنائی تصویروں اور مترجم کی مدد سے پیش کیا گیا)

رائل۔بات دسمبر ۱۹۷۳ء کی ہے میں ان دنوں پیرس کے ایک اخبار سے منسلک تھا۔ایک صبح جب میں اپنی کار سے دفتر روانہ ہوا تو مجھے عجیب سی بے چینی کا احساس ہو رہا تھا۔دوران سفر مجھے ایسا لگنے لگا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہونے والا ہے اور مجھے شہر سے باہر ایک مخصوص پہاڑی کی طرف جانا چاہیے۔میں خود کو نہ روک پایا اور اپنی کار مذکورہ پہاڑی کی جانب موڑ دی۔وہاں پہنچ کر جب کچھ خاص نہ پایا تو واپسی کے ارادے سے اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگا۔اچانک آسمان سے ایک اڑن طشتری سامنے اتری۔ایک دروازہ کھلا جس سے چھوٹے قد اور پتلے ہاتھ پاؤں والی تین چار انسان نما مخلوق باہر آگئی۔جب وہ سب میری طرف آنے لگے مجھے احساس خوف ہوا اور میں نے کار Start کرنا چاہا۔مگر ایک غیر معلوم مقناطیسی قوت نے مجھے اور میری کار کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔بس اتنا احساس رہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔کچھ وقت تک اڑن طشتری پرواز کرتی رہی اور کسی غیر مانوس مقام پر Land کر گئی۔مجھے پھر ایک خاص جگہ لے جایا گیا جہاں کا ماحول اور نظارہ بیحد مسحور کن تھا۔ہر چیز سے عظمت اور قدرت کا گمان ہو رہا تھا۔لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ کوئی احساس خوف نہیں رہ گیا تھا۔

کچھ وقفہ گزرا اور میں ایک ہستی کے روبرو تھا۔اس نے مجھے میری زبان میں مخاطب کیا اور خوش آمدید کہا۔میں حالت حیرت میں دیکھتا رہا۔اس نے اپنا نام Elohim بتایا اور کہا کہ وہ ہی زمین پر تمام زندگیوں کا خالق ہے۔جب بھی کسی سیارہ پر انسانی آبادی کی ۶۶۶ نسلیں پوری ہو جاتی ہیں تو سائنسی علوم خصوصاً Biotechnology اور Space Science اتنی ترقی کر چکے ہوتے ہیں کہ زندگی کی از سرنو

تخلیق کسی دوسرے سیارہ پر جو زندگی کی نشو نما کے لئے مناسب ہوتے ہیں ممکن ہو جاتی ہے۔ نئے سیارہ پر انسانی آبادی کا خالق پچھلے سیارہ کا انسان ہوتا ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ آگے اس نے بتایا کہ مجھے بحثیت سفیر منتخب کیا گیا ہے اور واپس زمین پر Elohim Embassy کے قیام کے ذریعہ تمام انسانی آبادیوں میں محبت، آزادی اور معاشرتی انقلاب پھیلانا میرا مقصد حیات ہوگا۔ مجھ سے قبل بھی منتخب انسانوں سے اس کی ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں جو Prophets کی شکل میں اس کی ہی تعلیم کو عام کرتے رہے ہیں۔ مجھے کئی دوسرے رموز سے بھی آشنا کرایا گیا۔ میں پچھلے سولہ سالوں سے مختلف ممالک میں Elohim Embassy کا قیام کر رہا ہوں۔ ہندوستان ۳۳واں ملک ہے۔

میں کسی مذہب کی مخالفت نہیں کرتا کہ یہ تمام ایک ہی خالق کا بیان کرتے ہیں۔ کسی الہامی کتاب سے انکار نہیں کرتا کہ یہ سب اسی کے کلام ہیں۔ کوئی بھی طریقہ عبادت میرے نزدیک غلط نہیں گر وہ ظلم و شر کو فروغ نہ دیتا ہو۔ آخر Elohim ہمارا خالق ہے اور وہ ہم سے بے حد محبت کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی بہترین تخلیق انسان بھی باہمی محبت سے ہمکنار رہے۔ ہم سب تب غلطی کرنے لگتے ہیں جب مذاہب کو الگ الگ بانٹ دیتے ہیں اور نتیجتاً اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے نفرت اور ایک دوسرے کا قتل کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ ہم سب Programmed Creature ہیں جو وقتی حدود میں زندگی کے مراحل گزار کر مادی طور پر فنا ہو جاتے ہیں۔ مگر ہمارے علم و عمل فنا نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہ دونوں غیر مادی ہیں۔ علم Elohim کی دین ہے اور عمل اس کا استعمال۔

(ظاہر ہے ایسی Provocative باتوں کے بعد تمام سامعین انتہائی Impatient ہو رہے تھے اور Rael سے سوال و جواب کے لئے پوری طرح تیار بھی۔ بڑی مشکل سے چند لوگوں کو موقع مل پایا۔ کچھ دلچسپ سوالات یوں تھے۔) ڈاکٹر ایچ خان (امریکی ماہر فلکیات)۔ کیا آپ اس سیارہ کا نام بتا سکتے ہیں جہاں آپ کو لے جایا گیا۔ وہ زمین سے کتنی دوری پر ہے اور آپ کو اس سفر میں کتنا وقت لگا۔

رائل۔ سیارہ کا نام ہمارے سائنس کے مطابق .... (کوئی ہندسہ والا نام) ہے۔ وہ زمین سے تقریباً تین روشنی برس دور ہے اور مجھے اس سفر میں سات دن لگے۔

خان۔ نام اور دوری دونوں صحیح ہیں مگر وقفہ ناممکن ہے۔ ابھی تک کوئی خلائی پرواز روشنی کی رفتار (ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ) سے آگے نہیں جا سکی ہے۔ پھر اس رفتار میں مادی وجود باقی نہیں رہ سکتا۔

رائل۔ ہماری سائنسی ترقی کائناتی نظام کے مقابلے بہت محدود ہے۔ کیا آپ کسی مذہب کو مانتے ہیں۔

خان۔ میں اسلام کا ماننے والا ہوں۔ رائل۔ تب تو یہ آپ کے لئے بڑا سہل ہے۔ قرآن میں معراج کا بیان ہے یہ وہی ہے جس نے کبھی طور کی پہاڑی پر خطاب کیا تھا۔ جنگلوں میں نور بن کر جلوہ افروز ہوا تھا۔ اپنے خاص بندے کو آسمانوں کو سیر کرائی تھی۔ کیا آپ اسکی قدرت کو محدود مانتے ہیں۔

ڈاکٹر ال ایم شریواستوا (AIIMS)۔ کیا آپ کو زندگی کی ابتدائی تخلیق کا راز بتایا گیا

رائل ۔ ہاں! مجھے بتایا گیا کہ زندگی کی کیمیائی شکل DNA(Deoxyribose Nucleid Acid) ہے اور اس کی تخلیق ہی زندگی کی ابتداء ہے ۔ دو صفات اسے جداگانہ حیثیت عطا کرتے ہیں ۔ پہلی Reprodution یعنی اضافہ تعداد اور دوسری Adaptation یعنی ماحولیاتی Adjustment۔

نامعلوم شخص ۔ آپ کے مطابق آپ Elohim سے جسمانی طور پر ملے وہ دیکھنے میں کیسا ہے اور کیا زمین پر آئیگا ۔ رائل ۔ وہ ہماری طرح ہے اس نے ہمیں اپنی ساخت پر پیدا کیا ہے اور وہ ۲۰۱۹ء میں زمین پر آئیگا ۔

مذکورہ شخص ۔ آپ کی عمر ۶۰ ۔ ۵۵ کے قریب ہوگی ۔ کیا تب تک آپ زندہ رہیں گے ۔

رائل ۔ یقیناً / نہال ۔ آپ کی نگاہ میں موت کیا ہے ۔

رائل ۔ موت ایک Programmed event ہے جو DNA کے Base Sequences میں Coded ہوتی ہے ۔ ہم Base Seauences میں تبدیلی کر زندگی کی لمبائی کم یا زیادہ کر سکتے ہیں ۔ موت Unprogrammed بھی ہوتی ہے ۔ مثلاً Accident یا بیماری سے ۔ خودکشی بھی ایک مثال ہے ۔ Unprogrammed Death حقیقتاً نامکمل علم اور غیر تشفی بخش نظام سے ہوتی ہے ۔ بیماریاں ہمیں اس لئے مار ڈالتی ہیں کہ ہم نے ان پر قابو نہیں پایا ہے ۔ Accidents ہماری ریاضی کمزوریوں اور Wrong Management سے ہوتے ہیں ۔ مگر ہم ان سب پر فتح پالیں گے اور تبھی تخلیقی اعتبار سے موت کی Programming کی جا سکے گی ۔ موت اس لئے خوفناک لگتی ہے کہ وہ آج تک Unpredictable ہے ۔

دوسرا نامعلوم شخص: Rebirth کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ۔

رائل: افادیت اور مقصدیت کے بنا پر یہ ایک لایعنی تخیل ہے جو ترقی و تبدیلی Progression & Variation کی نفی کرتا ہے ۔ (اپنے Misuse/Abuse of Knowledge Style اور Timing کی بنا پر Rael ۱۹۹۰ء میں کئی ایسی باتیں کہہ رہا تھا جو Biotechnology سے حالیہ دنوں میں سامنے آئی ہیں ۔ Rael کے ماننے والے اب ایک منظم International Raelian Movement چلا رہے ہیں اور چند ماہ قبل First Human Clone بنانے کا دعویٰ بھی انہیں کا ہے ۔ یہ لوگ زمین پر انسانی آبادی کے ۶۶۶ نسلوں کے پورے ہو جانے پر (ابھی تک ۶۶۰ نسلیں ہوئی ہیں) Human Clone کے ذریعہ دوسرے سیاروں پر Migration کی بات کرتے ہیں ۔)

پروفیسر نظیر صدیقی کے خطوط

(۱۲)

اسلام آباد: ۲۹رمئی ۹۶ء۔ برادر عزیز ڈاکٹر اعظم السلام علیکم آپ کا خط مورخہ ۳۰راپریل مجھے ۱۱رمئی کو مل گیا تھا۔ ادھر دو تین مہینے سے طبیعت ناساز رہنے لگی ہے۔ جسمانی کمزوری کا غلبہ رہا کرتا ہے جو خط تک لکھنے میں مانع آتا ہے۔ اس لئے جواب اتنی تاخیر سے جا رہا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میری دونوں کتابیں آپ کو مل گئیں۔ اگر آپ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے میری کتاب 'شہرت کی خاطر' منگوائیں تو مجھے اس کا علم یا اندازہ ہو جائے کہ اب ان کے ہاں میری کتاب دستیاب بھی ہے یا نہیں۔ میری ایک تنقیدی کتاب 'میرے خیال میں'، موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹ گولا مارکٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔۲، نے شائع کی تھی معلوم نہیں اب اس کے ہاں یہ کتاب ہے کہ نہیں۔ میری انگریزی کتاب Iqbal and Radhakrishnan اسٹرلنگ پبلشرز (پی وی ٹی) لمیٹڈ۔ ایل۔۱۰ Green Park Extension نئی دہلی۔۱۶ نے شائع کی تھی۔ قیمت/ 125۔ یہ کتاب بھی ختم ہونے کے قریب تھی۔ میں اپنے اخباری کالموں کا دوسرا مجموعہ جس میں آپ کی کتاب 'نصف ملاقات' سے متعلق مضمون شامل ہوگا شائع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ آپ جیسے قدرداں کو اپنی ہر کتاب بھیج دوں مگر یہ ممکن نہیں۔ آپ نے ڈاکٹر ملک راج آنند کا جو پتا بھیج دیا تھا اس پر میں نے انہیں اپنی ایک انگریزی کتاب Views and Reviews (اخباری مضامین کا مجموعہ) جو ڈیڑھ سال سے ان کے نام پڑا تھا بھیج دیا تھا۔ ہندوستان کے اس عظیم ادیب نے جس کی عمر 85 اور 90 کے درمیان ہوگی اپنی پیری کے باوجود بہت اچھا خط لکھا ہے۔ جب وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک بن چکے تھے میں اسکول کا طالب علم تھا۔ میں ۱۹۸۴ء میں دبئی اور ابوظہبی کے بین الاقوامی مشاعرے میں مدعو ہوا تھا۔ اس زمانے میں غالباً سلیم جعفری سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ سارا معاملہ پبلک relationing کا ہے جس کا ہنر مجھے نہیں آتا۔ تمام عمر میرا طرزِ عمل یہ رہا کہ اگر میری صلاحیت سے کوئی کام لے سکتے ہو تو لے لو اس کا معاوضہ دے سکتے ہو تو دیدو۔ خوشامد اور منت سماجت مجھے نہیں آتی۔ اسی لئے تو ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے اپنی یونیورسٹی میں بھی کوئی جگہ نہ مل سکی۔ کالم نگاری کے سہارے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے بارے میں اطلاعات کا شکریہ۔ آپ خدا بخش لائبریری جائیں تو میری کتابیں ضرور دیکھیں۔ وہاں میری نئی کتابیں ابھی تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔ Views and Reviews کے علاوہ اپنے نام مغربی ادیبوں کے خطوط کا ایک مجموعہ To Prof. Nazeer Siddiqi بھی ہے، اور 'حسرت اظہار' کا وہ نیا ایڈیشن بھی جو آپ کو بھیج چکا ہوں۔ نہ جانے یہ کتابیں وہاں کب تک پہنچ سکیں گی۔ خدا بخش لائبریری نے 'جدید اردو غزل' کے نام سے

ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس میں میرے انتخابات بھی ہیں۔ اس سے پہلے ان لوگوں نے فرانسیسی مقولہ نگار لاروش فو کو پر ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس پر لاروش فو کو سے متعلق میرے ایک مضمون کو پیش لفظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ سارے کام چھوٹے موٹے کام ہیں۔ زندگی کے جھمیلوں نے کوئی بڑا کام نہ کرنے دیا۔ شاید بڑے کام کی صلاحیت تھی بھی نہیں۔ اب زندگی کے آخری دور سے گزر رہا ہوں۔ لوگوں کی فرمائشیں بہت ہیں۔ یہ لکھ دو وہ لکھ دو۔ اب کچھ بھی لکھا نہیں جاتا۔ زندہ رہنے کے لئے کسی طرح ہفتہ وار کالم لکھ لیتا ہوں۔ لوگوں کو چاہئے کہ مجھے معاف کر دیں۔ آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔

آپ کے ہندوستانی ایروگرام کو چاک کرنے میں ہمیشہ کچھ سطریں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کاش آپ اہل ہند ایروگرام کی بجائے لفافہ استعمال کر سکتے۔

میرے دو ایک خط پوسٹ کر دیجئے گا۔ میرے عزیزوں کو اور اپنے ان عزیزوں کو جو آپ کی وجہ سے مجھے جانتے ہیں حسب مراتب سلام دعا کہہ دیا کیجئے۔ آخری آرزو یہی ہے کہ ایک مرتبہ آپ لوگوں سے ملاقات ہو سکتی۔ مگر دونوں ملکوں کے حالات (میرے ذاتی حالات کے علاوہ) نہایت حوصلہ شکن اور یاس انگیز ہیں۔ خدا خیر کرے۔ مگر وہ کہاں کرتا ہے۔

مخلص: نظیر صدیقی

پروفیسر حافظ شائق احمد یحییٰ، علی گڑھ

انڈمان و نیکوبار کے قدرتی مناظر

ہندوستان کئی اعتبار سے ایک عظیم ملک ہے۔ دنیا میں رقبہ کے لحاظ سے اسکا ساتواں نمبر ہے اور یہ ایک بہت بڑے طول وعرض میں پھیلا ہوا ہے جس کا کل رقبہ تقریباً ۳۳ لاکھ مربع کیلومیٹر ہے آبادی کے لحاظ سے بھی اس کا مقام دوسرا ہے۔ جغرافیائی حالات کی وجہ سے ہندوستان تہذیبی، مذہبی اور لسانی تنوع کا حامل ہے بلکہ اس ملک کی حیاتی تنوع بھی کافی وسیع ہے۔ آنجہانی جواہر لال نہرو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس ملک کے سب سے بڑے سیاح تھے، اور اس ملک کے کونے کونے کا سفر کیا تھا۔ میرے استاد مرحوم ڈاکٹر سالم علی بھی چڑیوں کے مشاہدہ اور سروے کے سلسلے سے بہت متحرک رہے اور شاید نہرو سے بھی زیادہ جگہوں کا سفر کیا۔ ناچیز کو پچھلے ۲۵ سالوں کے درمیان اندرون اور بیرون ملک کے متعدد جگہوں پر چڑیوں کے مشاہدہ کا موقعہ ملا ہے۔ جزیرہ انڈمان و نیکوبار کا سفر اور وہاں کی چڑیوں، خاص کر Narcondam Harnbill کا مشاہدہ، میری ایک دیرینہ خواہش تھی جو مارچ اور اپریل ۲۰۰۰ء میں پوری ہوئی۔

جزیرہ انڈمان و نیکوبار ہندوستان کے ۳۵ صوبوں میں سے ایک ہے، جو مرکزی تحویل (Union territories) میں شامل ہے۔ ہندوستان کا ایک اٹوٹ حصہ ہونے کے باوجود انڈمان جانے کیلئے وزارت داخلہ حکومت ہند یا وہاں کے چیف سکریٹری سے باضابطہ اجازت لینی پڑتی ہے۔ اسی طرح کے داخلی اجازت کی ضرورت اروناچل پردیش و ناگالینڈ وغیرہ جانے کیلئے بھی لینی پڑتی ہے۔ پہلے یہ قوانین سخت تھے لیکن اندرون ملک سیاحی کو فروغ دینے کیلئے اب بڑی آسانی سے اجازت مل جاتی ہے مگر چونکہ مجھے انڈمان کے ایک خاص جزیرہ ''نارکنڈم'' جانا تھا۔ اس لئے میرا یہ سفر کسی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ نارکنڈم، جو ہندی لفظ ''نرک'' یعنی جہنم سے اخذ کیا گیا ہے، چند سالوں قبل تک انسانی رہائش کے لئے یقیناً مشکل ترین جگہ رہی ہوگی جہاں میٹھے پانی کا کوئی چشمہ نہ تھا، اور پینے کا پانی ۱۵۰ کلومیٹر دور پورٹ بلیر سے پانی کے جہاز کے ذریعہ لایا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے یہاں پر کوئی قبائلی آبادی بھی نہیں ہے مگر یہ چھوٹا سا جزیرہ قدرتی مشاہدات کیلئے ایک ادر جگہ ہے۔ چونکہ نارکنڈم برما کے جزیرہ کوکو (Coco Island) اور تھائی لینڈ کے جزیروں سے نزدیک ہے، اس لئے دفاعی اعتبار سے اس کی خاص اہمیت ہے اور کوسٹ گارڈ کے جوان ان اطراف کے آبی اور انڈمان پولیس کا ایک دستہ ۱۹۶۴ء سے اس کی زمینی اور جنگل کی حدود کی مستقل نگہبانی کرتا ہے۔ ۱۴/۱۵ افراد پر مشتمل پولیس کی ایک نفری تین، تین مہینے کیلئے تعینات کی جاتی ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے درمیان یہاں ایک میٹھے پانی کے چشمہ کی دریافت کے بعد نارکنڈم جزیرہ اب ایک بہترین قدرتی تجربہ گاہ بن گیا ہے، اگر چہ یہاں پہنچنا اب بھی بڑا مسئلہ ہے۔

جزیرہ انڈمان نیکوبار، جسے انگریزوں نے آزادی کے سورماؤں کو قید کر کے ''کالا پانی'' کا نام دیا تھا، اب دھیرے دھیرے ایک مشغول سیاحتی مرکز بن رہا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں کے قدرتی ماحول میں بھی

تنزلی آرہی ہے۔ انڈمان تقریباً ۳۵۰ چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل ہے جو ایک طرح سے ٹوٹی ہوئی زنجیر کی شکل ہے اور اسے انڈمان صغیر (Little Andaman)، شمالی انڈمان (North Andaman)، وسطی انڈمان (Middle Andaman) اور نیکوبار (Nicobar) کے دور دراز جزیروں میں بانٹا گیا ہے۔ بڑے چھوٹے جزیروں پر مشتمل یہ علاقہ 16 اور 14 ڈگری شمالی قطب (N) اور 94 اور 92 ڈگری مشرقی قطب (E) کے درمیان واقع ہے۔ ان جزیروں کا علاقائی رقبہ تقریباً 8500 مربع کیلومیٹر ہے جب کہ آبادی تقریباً ڈھائی لاکھ ہے۔ 80 فیصد سے زیادہ رقبہ جنگلوں سے گھرا ہے جن میں منگرو و (Magrove) جنگل کافی مشہور ہیں۔ بارش کی زیادتی کی وجہ سے یہاں کے زیادہ تر جنگل سدابہار ہیں۔ مختلف طرح کے خاردار بیلیں (Creepers) بھی کثرت سے ملتی ہیں اور ناریل کے پیڑوں کے باڑھ سمندری ساحلوں کے کنارے ایک خوبصورت نظارا پیش کرتے ہیں۔ ان جزیروں کا درجہ حرارت عام طور سے 26 سے 30 ^{o}C تک ہوتا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ان جزیروں کے سلسلے کو دو بڑے خطوں یعنی انڈمان اور نیکوبار میں بانٹا گیا ہے۔ چھوٹے بڑے 350 جزیروں اور تقریباً 300 پتھریلی بڑی چٹان (Ilets/Rocks) میں صرف 40 انسانی آبادی پر مشتمل ہیں۔ عام طور سے یہ جزیرے چھوٹی چھوٹی سبز زار پہاڑیوں پر مشتمل ہیں۔ ان علاقوں میں حیاتیاتی تنوع کا ارتکاز وسیع پیانے پر ہوا ہے۔ اب تک جمادات کی پانچ ہزار اور بناتات کی تین ہزار قسمیں دریافت کی جا چکی ہیں۔ اس طرح انڈمان و نیکوبار ایک عالمی Biological P..otspot گردانہ جاتا ہے۔ (Barren Island) جزیرہ غیر ذی زرع ہندوستان کا واحد زندہ آتش فشاں پہاڑ ہے جہاں آخری بار 1998 میں لاوا پھوٹا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہاں کوئی پیڑ پودے یا جانور نہیں ہیں۔ سیڈل چوٹی شمالی انڈومان میں سب سے اونچی چوٹی ہے جس کی اونچائی 732 میٹر ہے۔ بیتاپور اور دگلی پور کے علاقے ہی صرف میدانی علاقے کہے جاسکتے ہیں۔ نیکوبار علاقے کے سمندر ریتیلے ساحل اور Coral reefs کے لئے بہت مشہور ہیں۔ اس علاقے میں ایک خاص چڑیا میگا پوڈ پائی جاتی ہے جو دس بارہ کے گروپ میں تقریباً 20 مربع میٹر کا پتیوں اور ریت کا ٹیلہ بنا کر انڈے دیتی ہیں۔ چڑیوں کی یہ واحد ذات ہے جو اپنے انڈے نہیں سیتی۔ پتیوں کی سڑن کی گرمی سے انڈے Inclubate ہوجاتے ہیں اور چوزے خود سے باہر نکل آتے ہیں۔ ان کی یہ حرکت انہیں اپنے آبائی مورث Reptiles سے نزدیکی رشتہ دار ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

سمندر انڈمان (Andman Sea) اکثر ایک بپھرا ہوا سمندر ہے جس کے اطراف میں دو مون سون متحرک رہتے ہیں۔ خوبصورت نیلے پانی کا یہ گہرا سمندر اپنے اندر قدرت کے بے شمار نوادرات سمیٹے ہوئے ہے۔ انڈمان کے ۳ بڑے حصے یعنی مرکزی، جنوبی اور شمالی ہی زیادہ تر آباد ہیں اور ایک دوسرے سے قریب قریب ہیں۔ دگلی پورے سے پورٹ بلیر تک بسیں چلتی ہیں جو درمیانی پانی کے حصوں کو فیری (Ferry) سے طے کرتی ہیں۔ ان علاقوں کو اب ایک ریلوے لائن سے جوڑنے کا منصوبہ ہے۔ یہ وہاں کے

رہنے والوں کے لئے ایک نایاب تحفہ ہوگا مگر قدرتی توازن اس سے متاثر ہوگا۔ نیکوبار پورٹ بلیر سے ۲۰۰ کیلومیٹر دور ہے جہاں کے جغرافیائی حالات اور قبائلی انڈمان سے مختلف ہیں۔ گریٹ نیکوبار، کار نیکوبار، اندرا پوائنٹ وغیرہ یہاں کی خاص جگہیں ہیں۔ انڈمان کے قبائلی نیگرونژاد ہیں اور جروا اور سینٹینیل (Jarwa & Sentinelese) ابھی تک پوری طور پر جنگلی ہیں۔ ان میں سینٹیلینس تو عام انسانوں کو دیکھتے ہیں تیر چلا دیتے ہی اور اس طرح وہ نہایت ہی خطرناک ہیں۔ اس لئے کوئی بھی انسان ان کے جزیرہ پر قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ دوسرے قبائل نیکوباری، اورنجی، انڈمانی اور سیپنس ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر خانہ بدوش قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کی خوراک مچھلی، جنگلی جانور اور پھل، کیلے، ناریل وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اب دھیرے دھیرے تھوڑی بہت کاشت کاری بھی کرتے ہیں۔ یہاں کے قبائل انڈمان نیکوبار کی آبادی کا تقریباً آٹھواں حصہ ہیں۔ ان قبائل کی آبادی قدیم روم (Rome) کے عظیم جغرافیہ داں Claudius Ptolemaek کے نقشہ پر دوسری صدی عیسوی میں دکھائی گئی ہے۔ چین کے مشہور سیاح Tsing نے ساتویں صدی عیسوی میں ان علاقوں کا سفر کیا تھا اور یہاں کے قبائلیوں کو آدم خور لکھا ہے۔ مغرب سیاحوں میں سب سے پہلے مارلو کپولو نے یہاں قدم رکھا تھا۔ درمیانی کئی محاذ آرائی، جیسے جاپانی، آسٹریلیائی حملے وغیرہ کے بعد ۱۷۸۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ کارنویلیس (Lord Cornwellis) نے مشہور سرویر (Surveyor) لفٹنٹ آرکی بالڈ بلیر (Lieutenant Archibald Blair) کو یہاں بھیج عام حالات معلوم کئے اور پھر بعد میں انگریزوں نے یہاں سیلولر جیل (Cellular Jail) بنوایا، جسے بعد میں کالا پانی کا نام دے دیا گیا۔ لفٹنٹ بلیر کے نام ہی سے پورٹ بلیر مشہور ہے۔

موجودہ بیشتر آبادی (85%) غیر انڈمانی مقیموں کی ہے جن میں آسامی، بنگالی، گجراتی، ہندی، ملیالی، تامل، اردو، پنجابی، اڑیا، مراٹھی، سندھی، کاشمیری وغیرہ بولنے والے لوگ بستے ہیں۔ اس طرح انڈمان کو چھوٹا ہندوستان (Mini or Little India) کہتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ وہ ہیں جنہیں انگریزوں نے سیاسی قیدی بنا کر یہاں رکھا ہوا تھا اور آزادی کے بعد وہ لوگ یہیں بس گئے۔ کچھ تجارت کی غرض سے آبسے ہیں تو کچھ سرکاری نوکری کرتے کرتے یہیں کے ہوگئے۔ 1974 سے کچھ بنگلہ دیشی پناہ گزیں بھی بس گئے ہیں۔ یہاں کے قدرتی مناظر موسم اور حالات اتنے دل کش ہیں کہ یہاں آنے والا ہر شخص یہاں ان سے تادیر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے حالیہ دورے کے بعد موجودہ ہندوستانی وزیراعظم شری اٹل بہاری باجپئی نے تو اپنی فعال سیاست (Active Politics) کے بعد انڈمان میں بسنے کا اعلان کر رکھا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے ہندوستان میں سب سے پہلے انڈمان ہی میں سوبھاش چندر بوس نے ہندوستان کی آزادی کا پرچم ۲۹ دسمبر ۱۹۴۳ء کو یہاں کے جزیرہ راسی پر لہرایا تھا۔

اندرا پوائنٹ جو کہ جنوب میں ہندوستان کا آخری نقطہ ہے۔ نیکوبار میں انڈونیشیا سے صرف ۱۵۰ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ پورٹ بلیر ((جو کہ جزیرہ انڈمان و نیکوبار کا صوبائی مرکز ہے) سے نیکوبار کا سفر

پانی کے جہاز سے تقریباً دو دنوں میں طے ہوتا ہے۔ پورٹ بلیر جانے کے لئے مدراس اور کلکتہ سے ہوائی اور آبی وسائل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ پانی کے جہاز سے کلکتہ سے تقریباً ۶۰ گھنٹہ کا سفر ہے، جو کہ صرف اچھے موسم میں ہی ممکن ہے۔ مدراس اور کلکتہ سے ہوائی سفر تقریباً دو گھنٹے کا ہے۔ اب سہارا اور جٹ ایرویز کی پرواز کی سہولت سے سفر بہت آسان ہوگیا ہے۔ جب میں نے ۱۹۷۷ء میں اپنی Ph. D کے لئے مرحوم ڈاکٹر سالم علی صاحب کے ساتھ بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے زیر تعاون کام کرنا شروع کیا تو قدرتی جگہوں اور مناظر کی سیاحی کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ پھر میں نے تقریباً ۴ سال کیرالہ کے Periyar Tiger Reserve میں گذارے جہاں میں نے اپنے Ph.D مقالہ کے لئے Barbets چڑیوں کی حالات زندگی اور Ecology پر کام کیا جو ایک کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں ڈاکٹر سالم علی صاحب انڈمان کے دورے پر گئے تھے۔ اس ٹیم میں شامل ہونے کی مجھے بہت خواہش تھی۔ مگر چونکہ میرا Field Work چل رہا تھا، اپنی خواہش کو اس وقت دبانا پڑا۔ پھر کئی سالوں تک دوسرے مشاغل کی وجہ سے وہاں کے سفر کا کوئی موقع نہ ملا۔ تقریباً ۲۰ سال بعد میں نے حسین عبداللہ صاحب کو (جو کہ ڈاکٹر سالم علی کے معتمد خاص تھے اور جنہوں نے نارکنڈم پر ۱۹۷۴ء میں تقریباً ایک ماہ مشاہدہ کیا تھا) علی گڑھ ڈاکٹر سالم علی میموریل لیکچر دینے کے لئے بلایا۔ انہوں نے اپنے لیکچر میں ایک تصویر (سلائڈ) نارکنڈم ہارنبل کی دکھائی اور کہا کہ یہ ایک مبازرت طلب (Challenging) چڑیا ہے اور کسی کو اس پر کام کرنا چاہیے۔ میرے انڈمان جانے کی خواہش پر ان کی اس تجویز نے مہمیز کا کام کیا اور میں نے اس سلسلے میں پیش رفت کی۔ ایک پروجیکٹ کا منصوبہ بنا کر British Ecological Society کو لندن بھیجا اور خوش قسمتی سے ان لوگوں نے ایک ہزار پونڈ کی رقم عنایت کردی، جو کہ اس دشوار اور خرچیلے سفر کے لئے وافر تو نہیں مگر غنیمت تھی۔ سب سے زیادہ دشواری مجھے کئی وزارات سے اجازت نامہ لینے میں ہوئی۔ علی گڑھ سے دلی کی نزدیکی نے بہت مدد کی اور متعدد بار کئی دفاتر کے چکر لگانے اور فون کرنے کے بعد وزارت دفاع، وزارت ماحولیات و جنگلات، وزارت داخلہ سے اجازت نامے ملے، جن کی بنا پر اور انڈمان و نکوبار Chief Wildlife Warden اور انسپکٹر جنرل آف پولس نے نارکنڈم جزیرہ پر رہنے اور مشاہدہ کرنے کی اجازت دی۔ اسکے بعد انڈمان کوسٹ گارڈ کے نائب چیف جناب وینیش بزجی صاحب اور ان کے معاون جناب طلحہ صاحب نے بھرپور تعاون کیا، اور پورٹ بلیئر سے نارکنڈم جزیرہ تک آنے جانے کے لئے دفاعی جہاز کا انتظام کردیا۔ یہ ایک بہت بڑی مدد تھی۔ کیونکہ اس دور دراز جزیرہ پر بغیر کسی بڑے جہاز کی مدد سے سفر تقریباً ناممکن ہے۔ ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ کوئی جہاز نارکنڈم جزیرے کے نزدیک نہیں آسکتا، کیونکہ وہاں کوئی بندرگاہ وغیرہ نہیں ہے۔ لہذا جہاز سے اتر کر ایک ربر کی ڈونگی میں ساحل تک آنا ہوتا ہے۔ پھر پانی میں اتر کر چکنے پتھر (Boulders) پر سنبھل کر ۴-۳ فٹ گہرے پانی میں چلتے ہوئے کنارے پہونچنا ہے۔ یہ جہاز کافی جدید طرز کا تھا۔ ہمارے رہنے کا اوپر کا کیبن مکمل ایرکنڈیشنڈ تھا۔ اور اس میں ٹیلی ویژن اور V.C.R. وغیرہ بھی لگا

ہوا تھا۔ ناگہانی حالات سے دو چار ہونے کے لئے ایک ہیلی کا پٹر بھی نصب تھا۔ کئی کئی چھوٹی چھوٹی لائف بوٹ بھی جہاز پر تھی۔ پورٹ بلیئر سے جہاز شام کے ۵ بجے روانہ ہوا۔ تھوڑی دور سفر کے بعد کھلے سمندر میں موسم بے حد خوشگوار تھا۔ چھوٹی چھوٹی اڑن مچھلی (Flying Fish) جہاز کے آگے آگے تقریباً ۲۰ سے ۳۰ میٹر تک سطح سمندر کے متوازی تھی۔ میں دیر شام تک جہاز کے ڈک پر رہ کر ان نظاروں لطف اندوز ہوتا رہا۔ صبح ۶ بجے کے قریب بیرن آئلینڈ کے نزدیک سے گذرتا ہوا تقریباً ۱۰ بجے جہاز نارکنڈم سے ۳ میل کی دوری پر لنگر انداز ہوگیا۔ وہاں سے ربر کی چھوٹی کشتی سے ساحل کے قریب تک لایا گیا۔ لائف جیکٹ کے سہولت سے ڈوبنے کا ڈر تو نہ تھا مگر سمندر کی اونچی لہروں پر ربر کی چھوٹی کشتی کے اچھال کی وجہ سے کچھ نہ کچھ ڈر لازمی تھا مزید یہ کہ ارد گرد شارک مچھلیوں کے موجود رہنے کی خبر بھی تھی۔ اس طرح گودتی اور پورٹ بلیئر سے اجازت نامے اور نارکنڈم پر قدم رکھنے کی داستان بے حد طویل اور تھکا دینے والی ہے، مگر نارکنڈم پر ایک عرصہ گذار کر مشاہدہ کرنے کا لطف ایسا ہے کہ اسے ہرانے کو جی چاہتا ہے۔ انڈمان کے سفر اور وہاں کے مشاہدات کا تفصیلی اور سائنسی بیان شعبہ وائلڈ سائنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رپورٹ اور بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے جرنل دسمبر ۲۰۰۲ء میں آچکا ہے۔ عام قاری کی دلچسپی کے لئے ذیل میں چند مشہور اور دلچسپ جگہوں کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہاں آنے والے ان جگہوں اور اداروں کو دیکھ سکیں اور لطف اندوز ہوسکیں۔

۱۔ پورٹ بلیئر: انڈمان نیکوبار کا صوبائی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ یہ جزیرہ ایک خوبصورت قدرتی شاہکار ہے۔ یہاں کا سیلولر جیل ایک تاریخی مرکز ہے جہاں آزادی کے جیالوں کو انگریزی حکومت نے تاحیات قید رکھا تھا۔ اب یہ ایک مشہور قومی یادگار اور سیاحتی مرکز ہوگیا ہے۔ روشنی اور آواز کے ذریعہ مشہور فلمی اداکار اوم پوری کی زبانی اس جیل کی کہانی ایک انمٹ نقش چھوڑتی ہے۔ سمندری عجائب گھر اور سمندری کھیل کے احاطے، لکڑی چیرنے کی اشیاء کی سب سے بڑی مل، ہاروچڑیا گھر، سی۔ پی۔ گھاٹ اور سمندری ساحل یہاں کی قابل دید جگہیں ہیں۔ یہاں کے طلوع وغروب آفتاب کے مراکز صبح وشام بے حد دلکش نظارا پیش کرتے ہیں۔ گلاس بوٹ سے سفر کر کے سمندر کے اندر مچھلیوں، کورل ریف کالونی اور طرح طرح کے کیکڑے، جھینگے وغیرہ کو جولی آئلینڈ کے نزدیک دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں کا یاتری نواس (مسافر خانہ) نہایت کشادہ اور پرفضا مقام پر ہے۔ یہاں کا مشہور بازار ابرڈین مارکٹ نہایت پر ہجوم رہتا ہے۔ اس کا نام مجھے سکاٹ لینڈ کے خوبصورت شہر جیسے Flower of Scotland کہتے ہیں اور جہاں سے میں نے M.Sc. کا ایک Module Course ۱۹۹۲ء میں کیا تھا، کی یاد دلا رہا تھا۔ ہوسکتا ہے خوبصورتی کی مماثلت کی وجہ سے یہ نام مشہور ہے۔ پورٹ بلیئر میں یوں تو ہر طرح کے لوگ بستے ہیں مگر زیادہ تر جنوبی ہندوستانی طرز زندگی ہے اور ہوٹل وغیرہ میں کھانے بھی زیادہ تر اسی طرز کے ملتے ہیں۔ یہاں ایک خوبصورت مسجد بھی ہے اور ایک بڑا مدرسہ بھی۔ ویسے زیادہ تر مسلمان ڈگلی پور کے علاقہ میں بستے ہیں۔ مجھے اپنے ایک دن کے قیام کے درمیان وہاں کی مسجد میں ایک تبلیغی جماعت سے ملنے کی بھی سعادت ملی تھی۔ پورٹ بلیئر میں ہر سال ۲۵ دسمبر کے درمیان ہونے والے

میلے میں انڈمان نیکوبار کے لوگوں کو ایک خاص رنگ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ پورٹ بلیر میں بین الاقوامی سیاحوں کے بڑے بڑے بحری جہاز اکثر رک جاتے ہیں جن کی وجہ سے بہت گہما گہمی رہتی ہے۔

۲۔ جزیرہ نارکنڈم: جیسا کہ ذکر آچکا ہمارے اس سفر کا خاص مقصد جزیرہ نارکنڈم پر پائی جانے والی چڑیا نارکنڈم ہارنبل کا مشاہدہ کرنا تھا۔ نارکنڈم جزیرہ پورٹ بلیر سے ۱۴۵ کیلومیٹر کی دوری پر ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جو نہایت ہرے بھرے جنگل اور خوبصورت نظاروں سے بھرپور ہے۔ یہاں کے ۶ ہفتے کے شب و روز میری زندگی کے ایک یادگاری سفر بن گئے ہیں۔ نارکنڈم ہارنبل کے تحقیق پر مبنی میرا مقالہ ابتک ۳ بڑے جرنلس میں چھپ چکا ہے اور ہندوستان کے کئی اداروں کے علاوہ امریکہ و چین کی ۳ یونیورسیٹیوں میں سلائیڈ کے ذریعہ اس پر لکچر بھی دے چکا ہوں۔ یہ درمیانہ سائز (تقریباً چیل کے برابر) کی چڑیا صرف جزیرہ نارکنڈم پر پائی جاتی ہے۔ یوں تو رقبہ (۶ مربع کیلومیٹر) کے لحاظ سے اس کی تعداد وافر ہے (تقریباً ۴۰۰) مگر صرف ایک جزیرہ پر رہنے کی وجہ سے اس کی بقا کو خطرہ لاحق ہے۔ نارکنڈم ہارنبل کی افزائش نسل کا طریقہ بے حد دلچسپ ہے جس میں مادہ اپنے آپ کو درخت کے کھوہ میں تقریباً ۳ ماہ تک محصور کر لیتی ہے۔ اس کا قدرے تفصیلی بیان تہذیب الاخلاق جنوری ۲۰۰۳ء میں آچکا ہے۔ افزائش نسل کے دوران بالغ جوڑے بڑے انہماک سے گھونسلے بنانے اور بچوں کی پیدائش کے بعد ان کو کھلانے میں لگے رہتے ہیں جب کہ نابالغ (Sub-adult bird) بڑے بڑے گروپ بنا کر ادھر ادھر درختوں پر کلکاریاں کرتے رہتے ہیں۔ صبح و شام ان کی آسمان میں قلابازیاں، پیڑوں پر دھینگا مستی اور تیز آوازیں ایک دلکش نظارا پیش کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس جزیرہ کا نام ہی ان پر رکھا ہوا ہے گو کہ یہاں تقریباً ۳۰ اقسام کی دوسری چڑیاں، کیکڑے، ایک بہت بڑا گوہ (Giant Monitorlizard) بھی پایا جاتا ہے۔ مگر نارکنڈم ہارنبل یہاں کی خاص چڑیا (Flagship Species) ہے۔ پولس پارٹی کے مستقل قیام کی وجہ سے اس جزیرہ پر ایک چھوٹا کچن گارڈن بھی ہے اور کیلے، ناریل، آم اور چند سبزی کی افراط رہتی ہے۔ یہاں کے سمندری کیکڑے اور طرح طرح کی مچھلیاں بھی کافی لذیذ ہوتی ہیں۔ کئی سال قبل پولس والے اپنے ساتھ چند بکریاں لے آئے تھے جن میں سے کچھ جنگلی ہوگئی تھیں اور ان سے یہاں کی مضافات (Ecology) کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ مگر اب انہیں تقریباً ختم کیا جاچکا ہے۔ ہمارے قیام کے درمیان بقرعید اور ہولی کے دن ہم نے چند بچے ہوئے بکروں میں سے دو بکروں کا شکار بھی کیا۔ سمندر کے بیچ واقع ہونے کی وجہ سے یہ آبی رطوبت کافی رہتی ہے جس کی وجہ سے ٹھمس سی رہتی ہے مگر دوپہر کے بعد سے صبح ۱۰۔۹ بجے تک پر افزا فضا رہتی ہے۔ بارش کے درمیان یہاں کا ماحول بے حد خوشگوار رہتا ہے مگر خراب موسم اور زیادہ بارش کے درمیان اونچی اونچی سمندری لہریں کیمپ تک آجاتی ہیں اور اکثر کافی مشکل پیدا کر دیتی ہیں۔

۳۔ سمندری عجائب گھر (Marine Museum): پورٹ بلیر کی قابل دید جگہوں میں یہ ایک دلچسپ جگہ ہے جہاں سمندری مخلوق کے دلکش نباتات و جمادات کا نمونہ رکھا گیا ہے۔ ایک مچھلی گھر

(Fish quirium) بھی ہے جو نہایت ہی معلوماتی ہے۔ اس کی داخلہ فیس بھی بہت کم ہے۔ سمندر میں پائے جانے والی عجائب الفطرت کا مظاہرہ اتنے موثر انداز میں شاید ہی کہیں اور ہے سب سے تعجب خیز ایک ضخیم سیپ کا Shell ہے جو تقریباً ایک میٹر لمبا ہے۔ مچھلیوں پر مطالعہ اور تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ ایک اہم جگہ ہے۔ ممبئی کے مشہور تاراپوروالا مچھلی گھر سے یہ عجائب گھر کافی بڑا اور متنوع (Diversified) ہے۔

۴۔ دگلی پور کا نکلس ساحل (Necklacae Beach): پورٹ بلیئر سے ۸ گھنٹے کی بس کی مسافرت یا ۱۴ گھنٹے کی پانی کے جہاز کے سفر کے ذریعہ دگلی پور جایا جاسکتا ہے۔ یہاں کا ساحل نہایت خوبصورت اور نیلے صاف وشفاف پانی کی وجہ سے سیاحوں کا ایک خاص مرکز بن رہا ہے۔ دوری کی وجہ سے یہاں سیاحوں کی بھرمار نہیں ہوتی اور جو لوگ سکون پسند ہیں وہ یہاں بہت لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہاں کے اناس اور آم بھی بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ ان اطراف میں Mangrove کے بے حد گھنے جنگل دل چھو جانے والے نظارہ پیش کرتے ہیں۔

۵۔ مایابندر: مایابندر جنوب انڈمان کا ایک خوبصورت علاقہ ہے اور یہاں کے ساحل سے سورج کا طلوع اور غروب ہونے کا نظارا ایک یادگار نقش چھوڑتا ہے۔ یہاں ایک بے حد خوبصورت گیسٹ ہاؤس ہے اور اگر وقت پر رجوع کیا جائے تو کمرے آسانی سے دستیاب ہوجاتے ہیں۔ سیاح یہاں پورٹ بلیئر سے سیدھے بس سے آسکتے ہیں اور اب تو سستی ٹیکسیاں بھی دستیاب ہیں۔ عین شہر سے ۱۰ کیلومیٹر کی دوری پر یہاں ایک بڑے ساحلی علاقے کو مرکز سیاحت کے طور پر آراستہ کیا جارہا ہے۔ یہاں کے ساحل بے حد صاف اور کھلے ہوئے ہیں۔ پورٹ بلیئر سے قریب کے کچھ اور مقامات بھی بے حد خوبصورت ہیں۔ ان میں چڑیا ٹاپو جزیرہ وائپر (Viper Island) جزیرہ ہادلک، مدھوبن، چٹان آئلینڈ ہیریر پہاڑی، وغیرہ کافی مشہور ہیں۔ ان جگہوں پر جانے کے لئے پورٹ بلیئر کے خوبصورت Tourist Office سے مزید معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔ بمبئی، مدراس، کولکتہ، دہلی اور کئی دیگر جگہوں پر انڈمان ونیکوبار کے متعلق وافر معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ دسمبر اور اپریل کے درمیان یہاں سفر نسبتاً آسان اور آرامدہ ہے جب کہ یہاں کم بارش ہوتی ہے۔ یہاں کے قبائلی طرز رہائش پر بنی Film Division کی ایک مشہور فلم Man in Search of man بہت معلوماتی ہے۔ یہاں مرکزی حکومت کے بھی کئی دفاتر ہیں اور کوسٹ گارڈ کا بہت بڑا مرکز ہے۔ یہاں کا پورٹ کافی مشغول رہتا ہے اور نیلے صاف سمندر میں تیرتے چھوٹے بڑے جہاز ایک دلکش نظارا پیش کرتے ہیں۔

اس طرح انڈمان ونیکوبار قدیم وجدید تہذیب کا ایک سنگم نظر آتا ہے۔ دور دراز کا یہ جزیروں کا دیش ہندوستانی ثقافتی گلدستہ کا ایک نہایت ہی خوشنما پھول ہے۔ قدرت نے اسے بے شمار عجائبات ونوادرات سے نوازا ہے یہاں آکر لوگوں کے عادات واطوار کو دیکھنا اور قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہونا زندگی کا ایک یادگار موقع ہے اور جو لوگ سفر کی صعوبت اور زادراہ کا معاشی بوجھ اٹھا سکتے ہوں انہیں کچھ دنوں یہاں آکر دنیاوی جنت کے اس چھوٹے سے نمونہ میں رہ کر ابدی جنت کے لطف کا احساس حاصل کرنا چاہئے۔

پروفیسر سید محفوظ الحسن، گیا

جگن ناتھ آزاد کثیر الجہت فنکار۔ ایک تاثر

ڈاکٹر منظر حسین نئی نسل کے ابھرتے ہوئے قلمکار ہیں، پیشے سے مدرس ہیں تحقیق وتنقید سے خاص شغف رکھتے ہیں، ''اقبال اور دانتے'' کے ذریعہ اپنی ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرت کا ثبوت پہلے ہی فراہم کر چکے ہیں۔

''جگن ناتھ آزاد ایک کثیر الجہت فنکار'' ان کی دوسری تصنیف ہے اس کتاب میں آزاد کی مختلف فنکارانہ جہتوں پر ان کے کلام وکتاب کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ آزاد اس عہد کی ایک معتبر اور قد آور شخصیت کا نام ہے۔ اس شخصیت کے مختلف گوشوں میں جھانکنا اور اس کی صحیح ترجمانی اور سچی عکاسی کرنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر ڈاکٹر منظر حسین نے اس مشکل مرحلے کو بڑی خوبی اور آسانی سے طے کر لیا ہے اور اس طرح طے کیا ہے کہ کہیں ان کا دامن جانب داری کے الزام سے داغ دار ہوتا نظر نہیں آتا اور یہ بہت بڑی بات ہے جگن ناتھ آزاد سے وہ مرعوب کن حد تک متاثر ہیں (جس کا اندازہ ابتدائیہ کے مطالعہ سے ہو جاتا ہے) مگر ان کی تحریروں اور تخلیقات کے حوالے سے جب ان کے فکر وفن پر گفتگو کی ہے تو بہت متوازن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس اظہار میں بے باکی بھی ہے اور خلوص کا جذبہ بھی۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ جگن ناتھ آزاد ایک اہم خوش فکر اور خوش گلو شاعر ہیں، بے باک صحافی بھی رہے ہیں، لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ اقبال پرست ہیں اور آزادی کے بعد ہندوستان میں اقبال کو ازسر نو مسند نشیں بنانے میں ان کا اہم رول رہا ہے۔ اقبال شناسی کا شاید ہی کوئی گوشہ اور کوئی جہت ایسی ہو جس پر ان کی نظر نہ گئی ہو۔ انہوں نے اقبال کو ہر جہت سے دیکھا، ہر پہلو سے سمجھا اور ہر زاویہ سے پیش کیا ہے۔ مگر یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آزاد نے تنقید کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور خاکے اور سفر نامے بھی تحریر کئے ہیں۔ دراصل ان کی شاعری اور اقبالیات سے ان کے لگاؤ نے ان کی اور دوسری صفات پر پردہ تو نہیں ڈالا ہے مگر شاعر اور اقبال شناس آزاد، خاکہ نگار، تنقید نگار اور سفر نامہ نویس آزاد پر حاوی رہا ہے۔

منظر حسین کی یہ کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ انہوں نے ایک ناقد، ایک خاکہ نگار اور سفر نامہ نویس کی حیثیت سے بھی ان کے مقام کے تعین کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ ممکن ہے منظر حسین کی رائے سے سبھوں کو اتفاق نہ ہو مگر منظر نے آزاد کی تنقیدات خاکوں اور سفر ناموں کے حوالے سے آزاد کی ناقدانہ بصیرت، سفر نامہ نویسی کے امتیازات اور خاکہ نگاری کی انفرادی شناخت کو جس طرح روشن اور واضح کیا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا انصاف کا خون ہوگا۔ یہ ممکن ہے کہ آزاد کو معتبر اور مستند ناقدین کی صف میں جگہ نہ ملے مگر یہ کیا کم ہے کہ منظر حسین نے ان کی تنقیدات کی روشنی میں انہیں ایک تاثراتی ناقد کی حیثیت سے اعتبار دلانے کی ذمہ داری غیر جانبداری سے نبھائی ہے اس طرح آزاد کی خاکہ نگاری اور سفر نامہ نویسی سے اس انداز میں متعارف کرایا ہے کہ ایک طرف آزاد کی

انفرادیت نمایاں ہوجاتی ہے تو دوسری جانب آزاد کے خاکوں اور سفرناموں کے براہ راست مطالعہ سے لطف اندوز ہونے کی تحریک ملتی ہے اور یہ منظر حسین کی ایک بڑی کامیابی ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا۔ مگر منظر حسین نے ان کی شاعری کے لئے جن گوشوں پر بالخصوص توجہ دی ہے وہ ہے ان کی نعتیہ شاعری، ان کی شاعری میں تقسیم ہند کا کرب، آزاد کی شاعری میں سیکولر افکار و عقائد ان کی رباعیوں میں اخلاقی اقدار و معیار، جگن ناتھ آزاد کے شخصی مرثئے اور جگن ناتھ آزاد اور ادب اطفال، آزاد کی شاعری کے یہ مختلف پہلو اور ان کی فکر کی یہ مختلف جہتیں بظاہر الگ الگ اور ایک دوسرے سے علیحدہ معلوم ہوتی ہیں مگر یہ باطن ان میں ایک خاص معنوی ربط ہے۔ جگن ناتھ آزاد جن حالات میں گھر سے بے گھر ہوئے اور ہندوستان میں جن حالات سے دوچار ہوئے یہ ان کا ہی جگر تھا کہ انسانی اقدار کی پامالی کے باوجود انسانیت سے ان کا ایمان نہیں اٹھا اور انسان دوستی، امن و آشتی، محبت، بھائی چارگی خلوص کی دولت جو وراثت میں ملی تھی اس کے پرچم کو بلند رکھا۔ ان مختلف عنوانات پر قلم اٹھا کر دراصل منظر حسین نے آزاد کی مذکورہ صفات کو پہچاننے اور دکھانے کی سعی مسعود کی ہے اور میرے خیال میں ان عنوانات پر خامہ فرسائی کا جواز بھی یہی ہے۔ منظر حسین کا انداز استدلالی ہے اور نتیجہ منطقی، وہ جو کچھ لکھنے میں سوچ سمجھ کر اور محتاط انداز میں لکھتے ہیں ان کی زبان سادہ مگر پرلطف ہے انہوں نے آزاد کے فکر و فن کے مختلف گوشوں پر خامہ فرسائی کے وقت اپنے قلم کی وضعداری کو قائم رکھا ہے۔ بدلتی قدروں کے اس عہد میں روایتوں کی صداقت کا احترام کرنے والے تخلیق کار کو منظر حسین کا یہ نذرانہ قابل تحسین ہے۔ یہ چند جملے تحریر کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔ میں ان کے شاندار مستقبل کیلئے دعا گو ہوں اور ان کے تئیں نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے ایک شاعر کا یہ مصرعہ ان کی نذر کرتا ہوں۔ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ایک لہر نئی نئی۔ ۱۰

ہر نظریہ جاوید ہوتا ہے یا نہیں، یہ ٹیڑھی کھیر ہے یا بحث طلب ضرور ہے۔ علم نجوم یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اعلیٰ کرّے کے روابط اور رشتوں کو جو اس کے کم تر کے ساتھ ہیں، دریافت کیا ہے۔ سحر قدرت (Natural Magic) کا کہنا یہ ہے کہ اس نے نیچرل فلسفے کو خیال آرائی کے سنگھاسن سے اتار کر عملی سطح دی ہے۔

کیمیا گری اس امر کی دعوے دار ہے کہ اس نے اجسام سے ان تمام اجزا کو الگ کیا ہے جو ان کا حصہ نہیں ہیں مگر جو قدرتی ترکیب میں بظاہر نظر نہیں آتے۔

لیکن ان مقاصد کے لئے حصول اور استنباط نقطۂ نظر کی حد تک بھی اور عملی سطح پر بھی غلطیوں اور بڑے بڑے دعووں سے بھرے پڑے ہیں۔

جہاں تک ادب میں نظریہ کے جاوید ہونے یا نہیں ہونے کی بات ہے، جان ڈون (Donne) کی نظم First Anniversary ملاحظہ کریں۔

نیا فلسفہ سب کے بارے میں شک کرتا ہے/ آگ کا عنصر بھی بس بجھا ہی دیا گیا ہے
سورج کھویا جا چکا اور زمین بھی/ اور...... کسی انسان کی عقل کام نہیں کرتی
کہ...... انہیں کہاں تلاش کیا جائے/ کھلے عام انسان یہ اعتراف کرتے ہیں
دنیا صرف ہو چکی ہے/ جب کہ سیاروں میں اور گردوں میں/ وہ کئی نئی تلاشیں کر چکے ہیں
اور اس کے بعد انہوں نے یہ بھی اہتمام کیا ہے/ کہ جو کچھ بھی تشکیل ہو چکا ہے
پھر سے ٹوٹ پھوٹ کر ذروں کی صورت اختیار کر لے/ چنانچہ سب کچھ ریزہ ریزہ ہے
تمام ہم آہنگی ختم ہو چکی ہے/ تمام بہتر مقاصد اور رشتے
شہزادے اور رعایا، باپ اور بیٹے کے ناطے/ بھلائے جا چکے ہیں
کیوں کہ ہر ایک فرداً فرداً یہ سوچتا ہے/ کہ بادشاہ گر پرندہ اس کے پاس ہے
پھر کیا کیا جا سکتا ہے/ کوئی ایسی تدبیر کہ وہ جو کچھ ہے صرف وہی ہو!

'نظریہ' یا تھیوری کی حقیقت کی تفتیش اور دریافت کے دو ذریعے ہیں۔ ایک جو حسیات (Senses) اور خصوصی اشیا سے بہت تیزی میں عمومی اولیات (Axioms) تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ پھر اصولوں تک اور مجوزہ حقیقت تک آتا ہے اور یوں درمیانی بدیہات حاصل ہوتی ہیں۔

دوسرا طریقہ اپنی اولیات کو حسیات اور خصوصی اشیا ہی کے حوالے سے مسلسل بلندی کی طرف سفر کرتے ہوئے آہستہ روی سے تشکیل دیتا ہے حتیٰ کہ وہ سب سے زیادہ معمولی اولیات تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ ایک شروع ہی سے تجریدی اور غیر سود مند طریقے بناتا ہے جب کہ دوسرا بہت آہستہ آہستہ ان اصولوں تک سفر کرتا ہے جو اپنی فطرت میں واقعی بہت مشترک ہوتے ہیں۔ نتیجے میں انسان خواہ تجربات کی بنیاد پر ہی کوئی نظریہ بناتا ہو یا قائم کرتا ہو وہ اپنے کام کے تحفظ کا متمنی ہوتا ہے۔ کسی بھی نظریہ کو قائم کرنے کے دوران سب سے پہلے علل (Causes) اور درست اولیت تک پہنچنا ضروری ہے کیوں کہ روشنی کی تمنا اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ ہر نظریہ کوئی قوت اور افزائش صحیح فکری منبع کے ذریعے عطا ہوتی ہے۔ اس صحیح فکر کو جو گردشوں، شعاعوں، آوازوں، رنگوں اور اجسام کے علم کے ساتھ ساتھ فہم کی قوت اور محبت بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اس طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نظریہ اپنی جڑوں سے الگ ہو کر جاوید نہیں ہو سکتا۔ نظریہ قائم کرنے کی دلچسپی کے عوامل تجربی (Empirics) یا عطریسی (Dogmatic) ہوتے ہیں۔ تجربی چیونٹیوں کی طرح محض ڈھیریاں لگاتے ہیں اور پھر اپنے جمع شدہ کو بعد میں استعمال کرتے ہیں۔ اور عطریسی محض مکڑی کی طرح اپنا جالا بننے میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن، نظریہ کو جاوید بنانے کے لئے ایک تیسری لہر بھی کام کرتی رہتی ہے جو ان دونوں کی درمیانی حیثیت کی حامل ہے۔ اور وہ ہے شہد کی مکھی جو اپنا مواد باغ کے پھولوں سے حاصل کرتی ہے مگر اس کے بعد اس پر کام کرتی ہے اور اس کی شکل بدل دیتی ہے۔ نظریہ کو جاوید بنانے والے صحیح لوگ اسی سے مشابہ ہیں کیوں کہ وہ نہ تو مکمل طور پر قوتِ ذہنی کے اصول پر ہی کاربند ہوتے ہیں اور نیچرل تاریخ اور خام میکانیت سے حاصل شدہ مواد ہی کو اپنی یادداشتوں پر پوری طرح حاوی کر لیتے ہیں بلکہ تمام حاصل شدہ مواد کو اپنے فہم میں بسا کر اس کی صورت گری کرتے ہیں۔

خالص ادب کی بات کریں تو ساختیات، پس ساختیات یا مظہریت، ردتشکیل، امتزاجی نظریہ یا تخلیقت پسندی کا نظریہ سبھی مسائل ہیں۔ موضوعیت دراصل علوم انسانی کا مرکزی مسئلہ ہے یا زندگی کا تصور نظریہ پر ہی قائم ہے۔ ٹیری ایگلٹن نے تھیوری کی اہمیت اور ضرورت سے کھل کر بحث کی ہے۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اس کا کہنا ہے کہ اس وقت علوم انسانیہ (Humanities) میں کرائسس ہے اور چوں کہ کرائسس ہے اس لئے تھیوری پر زیادہ توجہ ہے۔ دراصل تھیوری اس کرائسس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ سامنے آئی ہے۔ تھیوری کی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے ٹیری ایگلٹن کہتا ہے کہ یہ سوچنا گمراہ کن ہے کہ تھیوری زندگی سے الگ ہٹ کر کسی چیز کا نام ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں تھیوری ہے۔ زندگی کے کسی پہلو یا کسی عمل کے بارے میں غور کیجئے، اس کے پس پشت کچھ نہ کچھ تھیوری ضرور ملے گی۔ تھیوری ناگزیر ہے۔ سماجی زندگی کے جملہ ظہور پر نظریاتی

معنویت رکھتے ہیں۔یعنی کسی نہ کسی تھیوری کا حصہ ہیں۔ایگلٹن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے:

Just as all social life is theoretical, so all theory is real social life.

ادب اور تھیوری کے رشتے کی بات کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ادبی تھیوری کلی تھیوری یا 'میٹا تھیوری' کا صرف ایک حصہ ہے۔ادبی تھیوری غور وفکر کرتی ہے ادبی تنقید کے بارے میں، اور ادبی تنقید غور وفکر کرتی ہے ادب کے بارے میں اور ادب غور وفکر کرتا ہے زندگی کے بارے میں، چنانچہ تھیوری ہو یا ادبی تھیوری، معاملہ کی تہہ میں جو مسئلہ ہے وہ زندگی ہی کا ہے۔لہٰذا زندگی کی بات ہو یا ادب کی یا ادبی تنقید کی، بحث جب ادب کی نوعیت اور ماہیت کی اٹھے گی تو لامحالہ وہ تھیوری ہی ہوگی۔مائیکل پین کا کہنا ہے:

AT WHATEVER LEVEL IT IS UNDERTAKEN, THE PRACTICE OF LITERARY CRITICISM INEVITABLY LEADS TO QUESTION OF THEORY.

دراصل مسئلہ نظریہ کے جاوید ہونے کا ہے۔گویا انسان اور زندگی کا ہے۔بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اگر ہم فقط وحدت معنی یا کثرت معنی کی بات کریں تو زیادہ فرق نہیں پڑتا۔لیکن اگر مسئلہ حقیقت انسانی کی نوعیت کا ہو یا انسان کی شناخت یا انسان کی تحلیل ہوتی ہوئی پہچان کا تو پوری زندگی اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ادب اور ادبی تنقید کی حیثیت چوں کہ علوم انسانیہ کے نگہبان کی ہے۔ادب کا اس مرکزی مسئلے کی زد میں آنا ناگزیر ہے جسے لاکامی "Fading of the subject" موضوع انسانی کے تحلیل ہونے یا Crisis of Identity تشخص انسانی کے کرائسس سے تعبیر کرتا ہے۔

انسانی آگہی کے لئے نظریہ بنیاد بنتا ہے اور محرک کا کام کرتے ہے اس لئے جب یہ ناگزیر ہے تو ہر نظریہ یقینی طور پر جاوید ہوتا ہے۔

ایس۔ایم۔ابوذر،شیر گھاٹی،گیا

''ایڈس'' ایک تجزیاتی مطالعہ

اردو افسانے میں کہانی پن کی واپسی کے ساتھ جو چند نام اُبھرے اور آج جن کی حیثیت نمایاں دکھائی دیتی ہے ان میں عبد الصمد، حسین الحق، طارق چھتاری، شوکت حیات، شموئل احمد، شفق، غضنفر، اقبال حسن آزاد، مشرف عالم ذوقی، علی امام نقوی، اقبال انصاری اور چند دوسرے افسانہ نگار ہیں ان میں کچھ ایسے نام بھی ہیں جنہوں نے ناول نگاری سے بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔اور کامیاب ناول لکھے ہیں۔اس سلسلے میں عبدالصمد، حسین الحق، غضنفر اور مشرف عالم ذوقی کے ساتھ ساتھ شموئل احمد کا نام بھی لیا جاسکتا ہے لیکن شموئل احمد نے ناول میں وہ مقام ومرتبہ حاصل نہیں کیا جوان کے دوسرے معاصرین کے حصے میں آچکا ہے۔البتہ افسانہ نگاری میں ان کا امتیاز واختصاص مسلم ہے۔

شموئل احمد کا افسانوی مجموعہ ''سنگھاردان'' کئی سال قبل منظر عام پر آیا تھا اور اس نے عام قارئین کے ساتھ ساتھ افسانہ نویسوں اور تنقید نگاروں کی توجہ بھی اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔ابھی بھی اس کا اثر ادبی حلقوں میں برقرار ہے اور اکثر اس پر گفتگو بھی ہوتی رہتی ہے موجودہ افسانوی منظر نامہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا یا نہیں ہوتا۔میں سمجھتا ہوں کہ شموئل احمد کے دوسرے افسانوی مجموعہ ''القمبوس کی گردن'' سے اس منظر نامے میں ایک اور شق کا اضافہ ہو گیا ہے اس کی تقریباً تمام کہانیاں فکری وفنی دونوں جہتوں سے مکمل اور کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔زیر تجزیہ افسانہ ''ایڈس'' حد درجہ معنی خیز اور مؤثر افسانہ ہے۔

''ایڈس'' کے بارےمیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایک (EPIDEMIC) ہے جو جنسی بے راہ روی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اور ہلاکت خیزی میں سرطان سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔اس کہانی میں ''ایڈس'' کی جنک مسز چگائی ہیں جو جنسی بے راہ روی کی شکار ہیں جبکہ وہ ایک سیاسی نائکہ بھی ہیں سیکس اور سیاست کے ساتھ ان کا ایک ہی جیسا برتاؤ ہے چنانچہ افسانہ شروع ہی اس جملے سے ہوتا ہے کہ

''مسز چگائی کی زندگی میں سیاست اور سیکس آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔اس کہانی میں سیکس اور سیاست کا انضمام یا ہمکاری بہت ہی معنی خیز ہے مسز چگائی کو سیاست کا چسکا اس وقت لگا تھا جب وہ کمد ٹرکی ہوا کرتی تھیں۔اکنامکس کی ذہین طالبہ تھیں۔یونیورسٹی سمینار میں ایک بار انہوں نے نظام تعلیم پر پُرزور تقریر کر کے اپنی صلاحیت کا اظہار کر دیا تھا۔مہمان خصوصی وزیر تعلیم تھے وہ تقریر سن کر سٹپٹا گئے تھے۔اس کے بعد ہی وہ اسٹوڈنٹ یونین کی سکریٹری منتخب ہوئی تھیں۔کالج سے نکلنے کے بعد عملی سیاست کے طرف قدم بڑھایا اور خود کو ساچھر ابھیان سے جوڑ لیا اسی دوران چھوٹا ناگپور کے دیہی علاقے کے دورے کا موقع ملا اسی دوران جھرکھنڈی عوام کی معصومیت اور بے چارگی بھی سمجھ میں آئی۔اسی وقت انہوں نے جھرکھنڈی اندولن سے خود کو جوڑنے کا فیصلہ کر لیا کچھ آگے بڑھکر وہ مکتی مورچہ کی رکن بن گئیں۔اور عوام کو سرکار کے استحصال رویئے کے

خلاف بیدار و ہوشیار کرنے لگیں۔عوامی حلقے میں مقبولیت کے ساتھ ساتھ سیاسی حلقوں میں بھی نوٹس میں آ گئیں سیاسی رہنماؤں سے شناسائی بڑھنے لگی۔چمن لال چینچل انہیں رہنماؤں میں سے ایک تھے جو اپنے گروپ کے ساتھ پارٹی چھوڑنا چاہتے تھے۔وہ اب جھارکھنڈی سیاست کی بجائے دلت راج نیتی کی بات کرنے لگے تھے جب کہ وہ لیکھا کمیتی کے چیئرمین اور اعلیٰ کمان کے مشیر بھی تھی۔

اُن ہی دنوں مسز چگائی سے ملاقات ہوئی جس کی سادہ لوحی نے کمدٹر کی کو متاثر کیا اور دو چار ملاقاتوں ہی میں شادی ہوگئی۔اب کمدٹر کی مسٹر چگائی بن گئیں مسز چگائی اگری کلچر کالج میں اینمل ہسبنڈری کے لکچرر تھے اور سی۔ایم کے نجی فارم کے صلاح کار بھی۔لیکن مسز چگائی کی سیاست اور سیاسی مصروفیات میں مداخلت نہیں کرتے تھے البتہ کبھی کبھی ان کی بے ہنگم ہنسی اور بے ربط فقرے مسز چگائی کے لئے تکلیف دہ ہو اکرتے تھے ایسے موقعوں سے وہ مسٹر چگائی کو ٹال جاتی تھیں۔ان کا اصل مقصد سیاسی کیریر تھا اس لئے وہ گھوم گھوم کر جھر کھنڈ اندولن کا پرچار کرتی رہیں۔انہیں جھرکھنڈ راج کا سپنا گھر آنگن، کھیت، کھلیان، جنگل پہاڑ ہر جگہ دکھائی دیتا تھا۔اس سپنے کو انہوں نے اپنی آنکھوں کا ہی نہیں اپنے وجود کا حصہ بنالیا تھا۔

لیکن چمن لال چینچل کی لوک تنتر کی تشریح وتعبیر نے ان کا ایسا اثر کیا کہ اپنے سپنے کو آنکھ پر وجود سمیت بیچ ڈالا۔یہی وہ دن تھا جب سیاست اور سیکس گڈمڈ ہوئے تھے چمن لال چینچل نے سکھایا تھا کہ لوک تنتر نعروں سے چلتی ہے اس لئے لوک تنتر میں ضروری ہے کہ نئے نئے شبد جال رچے جائیں۔

لوک تنتر یا جمہوریت کے جس مکروہ چہرے کو مسٹر چگانی بھی اچھی طرح پہچانتے ہیں اسی لئے وہ چرچل کا حوالہ دیتے ہیں جس نے کہا تھا کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد اگر ڈیموکریسی ہوئی تو پچاس سالوں بعد کرمنل راج ہوگا۔اور آزادی کے پچاس سال ہوگئے۔

چمن لال چینچل نے اپنی مکروہ سیاست کے جال میں پھانس کر مسز چگانی کو سیاسی طوائف بنادیا۔دولت اور اقتدار کی ہوس ان میں پیدا ہوئی چمن لال چینچل انہیں عظیم مربی اور سچا غم گسار نظر آنے لگا وہ اس کے اشاروں پر ناچنے لگیں۔چمن لال چینچل نے جو سپنا دکھایا تھا وہ تھا بھی بہت سہانا۔

''کمد جی آپ میں پرتبھا ہے............آپ نیشنل فیم کی لیڈر بنیں گی'' اس کے بعد نہ کچھ سننے کے لئے بچا تھا نہ کچھ کہنے کے لئے۔

مسز چگائی چمن لال چینچل کی پارٹی میں شامل ہوگئیں اب ایک بڑا مقصد تھا منوواد کے خلاف لڑائی............دلت شوشت اور پیڑت کے لئے سماجک نیائے!''

چمن لال چینچل کی رہنمائی میں مسز چگائی شبد جال رچنا سیکھ لیتی ہیں اور غریب ریلی میں ایسی دھواں دھار تقریر کرتی ہیں کہ ایک بار پھر چرچے میں آجاتی ہیں۔راوی کے مطابق:۔

''ریلی کی رپورٹ اخباروں میں شائع ہوئی ان کا نام جلی حرفوں میں آیا تھا اور تقریر کے اہم حصے بھی شائع ہوئے تھے لیکن اسی صفحہ پر یہ خبر بھی تھی کہ ہندوستان میں ایڈس تیزی سے پھیل رہا ہے مسز چگائی کی نظر

اس خبر پر نہیں پڑ سکی تھی۔ ریلی کی رپورٹ میں وہ بار بار صرف اپنا نام پڑھ رہی تھی۔''

ظاہر ہے کہ دولت کی للک، اقتدار کی ہوس اور نام و نمود کا نشہ تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے نام اور چرچے کے سوا کچھ دیکھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ ویسے پنی یہ چیز مسز چگائی کے حصے کی تھی۔ اسلئے:

مسز چگانی نے ہاتھ میں اخبار لیا تو ان کے ہونٹوں پر پُر اسرار مسکراہٹ رینگ گئی'' ساتھ ہی ساتھ ایڈس کے بھی خبر شائع ہوئی ہے''

مسز چگائی نے جھک کر دیکھا.......... بھارت میں ایڈس.......... ان کو اچھا نہیں لگا اور وہ اخبار والوں کے خلاف بڑبڑائیں۔ لیکن چمن لال اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

''اخبار والے کیا کریں.......... ایڈس تو پھیل رہا ہے'' اور اس کی علامتیں ہیں۔ بوفورس گھوٹالہ، یوریہ گھوٹالہ جوتا گھوٹالہ، ساری دھوتی گھوٹالہ، وردی گھوٹالہ، لیٹر آف کریڈٹ گھوٹالہ، ہائی کورٹ میں کیس۔ سپریم کورٹ میں ضمانت۔ آخر کار چمن لال چنچل کی قیں قیں قیں سنکر مسز چگائی باتھ روم میں گھس جاتی ہیں اور حسب معمول فلش چلاتی ہیں لیکن اب کے ان کو بہت بار فلش چلانا پڑا۔ ظاہر ہے کہ سیاست اور خاص کر لوک تنتریا جمہوریت کی آبرو کے ساتھ ہوتے ہوئے اس ریپ سے چمن لال چنچل اور مسز چگائی اچھی طرح واقف ہیں لیکن اس سے پیدا ہونے والے ایڈس سے برہم نہیں ہیں لیکن مسز چگائی کے حصے میں یہ برہمی آتی ہے اور وہ موقع بموقع اس برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اس کے خلاف انقلاب زندہ باد یا احتجاج بلند نہیں کر سکتے لیکن وہ بھی کسی نہ کسی طرح اسی نظام کا حصہ ہیں چنانچہ راضی بہ رضا ہو جاتے ہیں البتہ کمدٹر کی یا مسز چگائی یا چمن لال چنچل کی اب کوئی انفرادی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ مسز چگائی مکروہ سیاست کی علامت تو چمن لال چنچل مکار سیاست پیشگی کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ جو ایک اجتماعی نقطۂ نظر ہے۔

افسانہ نگار نے بڑے اچھوتے اور انوکھے انداز میں نشاندہی کی ہے کہ آزادی کے بعد سیاست ماس لیڈرشپ سے محروم ہوگئی اور پارٹی لیڈرشپ کا دور آیا جب کہ پارٹی لیڈر نے صرف پارٹی کے ہت میں سوچنا شروع کیا لیکن ۸۵ء کی بعد سیاست بدفعلی بن گئی اور بالآخر سیاست کا اپرادھی کرن ہو ہی گیا جس کا اندیشہ چرچل نے ظاہر کیا تھا گویا کہ سیاست کی بساط جمہوریت کا چہرہ بُری طرح پٹ گیا۔

اس سیاسی موضوع کو افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی اور ہنرمندی کے ساتھ افسانے کے قالب میں ڈھالا ہے اس میں واقعاتی تسلسل ارتقائی صورت میں دکھائی دیتا ہے اور پلاٹ کی تنظیم گتھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں کردار بھی سپاٹ نہیں ہیں اور مکالمہ کی ہر چند کہ افسانے میں اہمیت ڈرامے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن اس کہانی میں مکالمہ بعض اوقات برجستہ برمحل اور موثر معلوم ہوتا ہے افسانہ نگار کا نقطۂ نظر بھی واضح ہے وہ موجودہ جمہوریت کو یا جمہوری نظام کو سرے سے رد کرتا ہوا نظر آیا ہے یہ اس کا انفرادی نقطۂ نظر ہوتے ہوئے بھی اجتماعی احساسات و جذبات کا ترجمان دکھائی دیتا ہے.......

میں سمجھتا ہوں کہ اپنے فکری اور فنی مقصد کے حصول میں افسانہ نگار نے پوری پوری کامیابی حاصل کی ہے۔

حمّاد انجم، ایڈوکیٹ، سنت کبیر نگر (یوپی)

''چہ بے خبر ز کلام و مقامِ اقبال است''

''فکرِ اقبال پر ایک تنقیدی نظر'' ـــــ بھی انور شیخ کی ایک متنازعہ اور ہنگامہ پرور کتاب ہے۔ اس کتاب سے متاثر ہو کر حاجی مشرف امام نے ایک مضمون ـــــ ''میری نظر میں فکرِ اقبال پر ایک نظر'' قلمبند کیا ہے جو ''تمثیل نو'' جلد۳، شمارہ۲ کی زینت بنا ہے۔ مشرف امام صاحب نے انور شیخ کی مذکورہ کتاب کے متعلق قریب قریب کچھ نہیں لکھا ہے البتہ اقبال کے متعلق کچھ لکھ کر بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ بقول حاجی مشرف امام پٹنہ انور شیخ نے اقبال کے بیشتر اشعار کی بخیہ گری کی ہے...... یہاں لفظ ''بخیہ گری'' محلِ نظر ہے۔ قبلہ حاجی صاحب نے اپنے مضمون میں دو ایک مثال دیکر اقبال کے اشعار کو ''غیر شرعی'' اور ''کفر سے بھرا ہوا'' لکھ کر گویا اقبال کے مسلمان ہونے پر ہی سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔

شاعرِ مشرق حکیم الامت علامہ اقبال کے چند اشعار پر قبلہ حاجی صاحب نے جس انداز سے خامہ فرسائی کی ہے اس سے ان کی علمی حیثیت اور فکری قد و قامت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن موصوف محترم تو ''مشرف'' بھی ہیں اور ''امام بھی اور سونے پر سہاگہ کہ ''حاجی'' بھی ہیں...... چنانچہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی کیفیت کا سامنا ہے ـــــ!

اقبال بلند نگاہ، عالی فطرت اور مومنانہ فکر و نظر کے شاعر ہیں۔ جس شاعر نے بیس سال کے مطالعہ کے بعد انسان اور انسانیت کی بقا کی ایک راہ نکالی ہو جس کا جواز کلام مجید، احادیث نبوی اور اسلامی فلسفہ و حکمت میں ملا اور جن کی بنیادوں پر انہوں نے اپنی فکر کی عمارت استوار کی ہو اس کے بارے میں ہمہ شما کا اتنی آسانی سے فتویٰ دے دینا ہرگز مستحسن اور قابلِ اعتنا نہیں۔ اقبال کو سمجھنا اتنا آسان بھی نہیں ہے کہ یہ شاہیں بڑی مشکل سے زیرِ دام آتا ہے۔ اقبال کی فکری فضا بڑی بلند اور بسیط ہے۔ اس کی پرواز بڑی اونچی ہے۔ اقبال پر لکھنے کے لئے کم از کم قلم پکڑنے کا سلیقہ تو سیکھ ہی لینا چاہئے؟ کسی کو سمجھنے اور اس پر لکھنے کے لئے فکر و نظر کے شیشے کا صاف اور ذہن کا بالکل خالی اور غیر جانب دار ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ جب صاحب مضمون نے اقبال کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا ہے اور اقبال کے تعلق سے ان کا ذہن کبھی صاف نہیں رہا تو پھر ظاہر ہے نتیجہ بھی ''مشکوک'' ہی برآمد ہوگا!

فاضل مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں ـــــ کہ جب اقبال نے جواب شکوہ لکھا تو ملاؤں نے

اقبال کو رحمۃ اللہ علیہ کے خطاب سے نواز دیا...... ایں چہ بوالعجبی است؟ ظاہر ہے کسی کو رحمۃ اللہ علیہ اس کی وفات کے بعد ہی کہتے یا لکھتے ہیں۔ جب ''جواب شکوہ'' لکھا تو اقبال بقید حیات تھے تو رحمہ اللہ علیہ کا خطاب مرحمت فرمائے جانے کی بات کہاں تک درست ہوگی...... سمجھا جا سکتا ہے!

''شاعرِ قرآن''، ''شاعرِ اسلام''، ''شاعرِ مشرق'' اور ''حکیم الامت'' جیسے خطابات سے اقبال یوں ہی، بلاوجہ تو نہیں نوازے گئے ہوں گے ع زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ اور پھر یہ القاب وخطابات باعث ''زباں بندی'' تو نہیں ہو سکتے، کلام کی بھرپور گنجائش موجود ہے شرط یہ ہے کہ منہ میں زبان ہونی چاہئے۔

کلام اقبال کو کما حقہ سمجھنے کے لئے یک گونہ سنجیدگی کے ساتھ تخئیل وتفکر اور علمیت کو دعوتِ نظر دینی پڑے گی، قرآن وحدیث، تاریخ وسیر، زبان وبیان اور دیگر علوم کا بھرپور مطالعہ کرنے کے بعد ہی فکر اقبال کے اسرارِ نہانی منکشف اور آئینہ معانی ـــــ منور ہوں گے۔ ورنہ ظلمتوں میں اسی طرح ٹامک ٹوئیاں مارنے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

اب آیئے ذرا حاجی مشرف امام صاحب کے فرموداتِ عالیہ پر نظر ڈالتے چلیں۔ موصوف رقم طراز ہیں ـ کھلے جاتے ہیں اسرارِ نہانی گیا دورِ حدیثِ لن ترانی۔ کیا کوئی مسلمان، شریعت کا پابند حدیث کو لن ترانی کہہ کر مثال پیش کرسکتا ہے، بلاشبہ یہ ایک غیر شرعی شعر ہے۔'' موصوف مزید تحریر فرماتے ہیں ـ ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار وہی مہدی وہی آخر زمانی اس شعر سے متعلق انور شیخ کی سوچ صد فیصلہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اقبال خودی کے مداح اسی لئے تھے کہ وہ خود کو مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح مہدی علیہ ثابت کرسکیں...... ''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ مذکورہ بالا دونوں اشعار ''بالِ جبریل'' کی ایک رباعی کے شعر ہیں۔ اسی رباعی میں ''حدیث نبوی'' کو ''لن ترانی'' کہنے جیسی کوئی بات نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ فاضل مضمون نگار کو زبان دانی سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ حدیث کا لغوی معنی...... بات، نئی چیز، ذکر، قصہ اور تاریخ...... ہے اور اصطلاحِ شرع میں حضور رسول کریم ﷺ کے قول وفعل کی خبر کو حدیث کہتے ہیں۔ اسی طرح لن ترانی بمعنی تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا، خودستائی، انانیت اور شیخی کے ہیں۔ یہ رباعی قرآنی تلمیح ہے۔ حضرت موسیٰ نے جمالِ الٰہی کا نظارہ کرنے کی خواہش کی تو جواب آیا...... ''لن ترانی...... تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔'' لیکن معراج میں ''اُدْنُ مِنّی کی صدا بلند ہوئی گویا کہ ''لن ترانی'' کے پوشیدہ اسرار ورموز سے معراج میں ادن منی کے ذریعہ پردہ اُٹھ چکا تھا۔ اسرار نہانی آشکار ہو چکے تھے اسی واقعے کی طرف رباعی میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی موسیٰ پر جو اسرار نہاں تھے وہ حضرت محمدؐ پر عیاں ہو چکے ہیں۔

خودی کا مطلب بھی صاحب مضمون نے غلط سمجھا ہے۔ خودی کا مطلب خود شناسی اور

معرفت نفس ہے، انانیت، غرور اور تکبر نہیں۔ اقبال کے فلسفہ مس خودی، عشق اور فقر تینوں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں جن کا خمیر خدائے تعالیٰ کے ارشادات اور رسول اللہ کے فرمودات سے تیار ہوا ہے۔ آخر زمانی اور آخرالزماں کا مطلب نبی آخرالزماں یا نبی آخرالزماں کے سوا کیا ہے؟ اب مطلع بالکل صاف ہے۔ اہل نظر خود فیصلہ فرمائیں کہ شعر ''غیر شرعی'' ہے؟

ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ ابھی تک اقبال کو مرزائی اور احمدی ثابت کیا جاتا رہا ہے لیکن اب تو انہیں ''مہدی علیہ'' کا مدعی گردانا جارہا ہے ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کو ''کفر سے بھرا ہوا'' شعر قرار دیا ہے لیکن اس شعر میں کفر کا کون سا قرینہ موجود ہے نہیں بتایا۔ مذکورہ شعر میں بہت سیدھی سی بات کہی گئی ہے کہ بندہ اپنی معرفت نفس میں اتنا کھڑا کامل اور پختہ ہوجائے کہ قیامت میں خدا اس سے خود پوچھ لے کہ اے بندے میں تجھ سے اتنا خوش ہوں کہ تو خود بتا کہ تو کیا چاہتا ہے؟ انسان کی معرفت نفس اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے، اس کو اللہ رب العزت نے محض اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔

محترم فاضل مضمون نگار نے تحریر کیا ہے کہ...... ''مجھے اقبال کا مندرجہ ذیل شعر شروع سے ہی کفر سے بھرا نظر آتا تھا۔ لیکن زبان خاموش تھی کہ ''شاعر اسلام'' اور ''شاعرِ قرآن'' کے تئیں مجھ جیسا کم پڑھا لکھا آدمی کیا بول سکتا ہے ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کیا یہ منصور کے اناالحق سے ملتی جلتی آواز نہیں ہے۔ یہاں بندہ یعنی غلام، مالک یعنی خالق سے بھی بڑھ کر ہوگیا ہے...... یہ تو سراسر شرک ہے......'' گویا کفر سے بھرا ہوا شعر شرک سے لبریز ہوگیا۔ کیا شرک اور کفر میں فرق نہیں ہے؟ بندہ جب معرفت کی معراج حاصل کر لیتا ہے تو خدا کا مُقرّب ہو جاتا ہے۔ یہی تھیم اور مرکزی خیال ہے اس شعر کا۔ شعر اناالحق کا نعرہ نہیں ہے...... اگر اقبال کا ''نورِ بصیرت'' عام ہوتا تو انور شیخ یا مشرف امام سے ایسی تحریر سرزد نہیں ہوتی ۔

خدایا آرزو میری یہی ہے
کہ تو ''نورِ بصیرت'' عام کردے

ڈاکٹر مجید بیدار، حیدرآباد

نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کے

دورِ اقتدار میں تعلیمی اور علمی ادارے۔ (قسط:۳)

(۴) تدوینِ نصاب کے ادارے (Institution for Compilation of Syllabus)

میر عثمان علی خان کے دور میں سرکاری سرپرستی کے علاوہ خود خانگی سطح پر کئی ایسے علمی ادارے موجود تھے جنھوں نے عام انسان کو علم سے رغبت دلانے کے لئے مجوزہ نصاب کے اساس پر کئی کتابیں مرتب کیں۔ کسی کمیٹی، ادارے یا فن کے ماہر کی جانب سے مختلف علوم وفنون کے اہم نکات کو پیش نظر رکھ کر ان نکات کی بنیاد پر کتابوں کی ترتیب یا اس کی اشاعت کے لئے کوشش کرنا تدوین نصاب کا درجہ رکھتا ہے۔ عہد عثمانی میں تدوینِ نصاب کے کئی سرکاری اور خانگی ادارے قائم ہوگئے تھے جنھوں نے مذہبی، تعلیمی اور علمی اعتبار سے بہترین نصابات کی تدوین پر توجہ دی جسے دورِ حاضر میں بھی معیاری نصاب کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے ریاست حیدرآباد میں نصاب کی ترتیب کے اہم خانگی اداروں میں انجمن ترقی اُردو حیدرآباد اور شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کا شمار ہوتا ہے۔ انجمن ترقی اُردو نے ریاست حیدرآباد کے مدارس کے لئے اوّل جماعت سے لے کر انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے لئے باضابطہ نصاب کی تیاری اور کتب کی فراہمی کی ذمہ داری قبول کی اور ریاست حیدرآباد کی جانب سے اس مقصد کے حصول کے لئے انجمن ترقی اردو کو سرمایہ بھی فراہم کیا گیا۔ اردو نصاب کی کتابیں اس خانگی ادارے نے تیار کیں جب کہ دیگر علوم وفنون کی کتابوں کی تیاری کے لئے سائنس، حساب، تاریخ اور جغرافیہ کے اساتذہ نے خود ذمہ داری قبول کی اس طرح خانگی اداروں کی شخصی دلچسپی کے نتیجہ میں ریاست حیدرآباد میں علمی اور نصابی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ سرکاری سرپرستی میں دو اہم اداروں نے علمی کارناموں کا بیڑا اٹھایا جنھیں ''دائرۃ المعارف'' اور ''دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دائرۃ المعارف کے توسط سے عربی زبان کے مایہ ناز فن پاروں کو متعارف کروانے کا بیڑا اٹھایا گیا جب کہ دارالترجمہ کے ذریعہ مختلف علوم وفنون پر گیارہویں جماعت سے لے کر گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے لئے درکار نصابی کتابوں کے اردو میں ترجمے کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ یہ دونوں ادارے اس قدر تاریخی اور علمی اہمیت کے حامل ہیں کہ جن کی خدمات کو کسی لحاظ سے بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانی سے شائع شدہ کتب کی اہمیت آج بھی مسلم ہے اور اسی طرح دائرۃ المعارف حیدرآباد کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ شعبۂ دینیات کی جانب سے جامعہ عثمانیہ نے جو نصاب مرتب کیا اور اس کے نتیجہ میں ''رسالۂ دینیات'' کی شکل میں کئی چھوٹے چھوٹے رسالے مرتب کئے گئے اور اسی طرح عربی کو عام انسانوں تک مقبول بنانے کے لئے ''منہاج العربیہ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ قرآن

ناظرہ پڑھانے کے لئے ''قاعدے'' کی ترتیب اور پھر بعد میں ''یسرنا القرآن'' کی تدوین خود اس بات کا ثبوت ہے کہ عہد عثمانی میں تدوین نصاب کے ادارے عروج کو پہنچ چکے تھے۔ اسی عہد میں قاری کلیم اللہ نے ''مدرسیہ دینیہ کلیمیہ'' کی بنیاد رکھ کر قرآن کی تجوید کے لئے چھوٹے چھوٹے رسالے ترتیب دیئے چنانچہ قاری کلیم اللہ کے رسالوں کو بھی تدوین نصاب کی سرشت میں شامل کیا جائے گا جو ''سہل تجوید'' کے نام سے پہچانے جاتے ہیں غرض میر عثمان علی خان کے عہد میں ریاست حیدر آباد کو تدوین نصاب کے سرکاری اور خانگی اداروں کی کارکردگی کی وجہ سے شہرت حاصل رہی اور ان اداروں کی طرف سے مرتبہ کتابوں نے علمی ماحول میں ایک بہت بڑا انقلاب برپا کر دیا اور اسی وجہ سے شہر حیدر آباد کو ایک علمی گہوارے کا درجہ حاصل ہو گیا۔

(۵) نصاب کی اشاعت کے ذمہ دار ادارے (Institution for the Publication of Syllabus)

میر عثمان علی خان کے عہد میں نصابی کتابوں کی اشاعت اور ان کی نکاسی کا کام انجام دینے والے مختلف ادارے شہر حیدر آباد میں قائم ہو گئے ان اداروں میں خانگی کتب فروش بھی موجود تھے اور بعض افراد کی شخصی دلچسپی بھی شامل حال تھی انجمن ترقی اُردو حیدر آباد نے ریاست حیدر آباد کی کئی نصابی کتابیں شائع کیں۔ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کا اپنا ذاتی مطبع تھا۔ دائرۃ المعارف کی کتابیں دار الطبع سرکار عالی میں شائع ہوتی تھیں ان کے علاوہ شہر میں کئی خانگی مطابع قائم ہو گئے تھے جن میں اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد کو افضلیت حاصل تھی۔ علم کو عام انسانوں تک پہنچانے کے لئے ان اشاعتی اداروں نے اہم کارنامہ انجام دیا اور یہ بات ثابت ہوئی کہ ریاست حیدر آباد میں اگر چہ میر عثمان علی خان کے دور اقتدار سے قبل بھی کتابوں کی اشاعت کا کام انجام دیا جاتا تھا لیکن عہد عثمانی یعنی ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک اشاعت کی کارروائی میں تیزی آ گئی۔ اس کام کے لئے اردو ٹائپ اور جدید ٹکنالوجی سے استفادہ کے لئے بھی کوششیں کی گئیں اور اردو میں آسانی سے کتابیں شائع کرنے کے لئے حکومت کی سرپرستی میں کمیشن بھی بٹھایا گیا جو خود اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ عہد عثمانی میں علمی ترقی کے ہر پہلو کو اختیار کر کے یہ کوشش کی گئی کہ انسانی ذہنی سطح کو بلند کیا جائے اور اس مرحلہ میں اقتدار کو بہر حال کامیابی حاصل ہوئی۔

(۶) دیگر علمی ادارے یا (Other Academic Institution)

ریاست حیدر آباد میں علم کے فروغ اور عوام میں علم سے رغبت پیدا کرنے کا رجحان آصفجاہی سلطنت کے ہر بادشاہ کے دور میں رہا لیکن اسے عروج نواب میر عثمان علی خان کے دور میں حاصل ہوا جس کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ میر عثمان علی خان کے دور سے قبل ان کے والد محترم نواب میر محبوب علی خان کے عہد ۱۸۸۵ء میں ''ریاستی مرکزی لائبریری'' کی بنیاد رکھی گئی اور اس عوامی کتب خانے کو ۱۸۹۱ء میں عوام کے استفادہ کے لئے کھول دیا گیا اس لائبریری کے سربراہوں میں سید حسن بلگرامی اور ملا عبد القیوم کا شمار ہوتا ہے اور یہ کتب خانہ آج بھی ''کتب خانہ آصفیہ'' کے نام سے شہرت رکھتا ہے اور جسے آج بھی

کتابوں کے عجائب خانہ کا درجہ حاصل ہے۔ میر عثمان علی خان کے دورِ اقتدار میں نہ صرف کتب خانہ آصفیہ کو وسعت دی گئی بلکہ اس کتب خانے کو کئی اہم اُمور سے وابستہ بھی کر دیا گیا اس کتب خانے میں علوم و فنون کی کتابوں کے ذخیرے کے دوران کئی زبانوں کا لحاظ رکھا گیا چنانچہ عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، ہندی، تلگو، مرہٹی، کنڑی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی اور دوسری یوروپی زبانوں کے لئے علاحدہ علاحدہ شعبہ قائم کئے گئے۔ ہندوستانی زبانوں کے علاوہ ایشیائی اور یوروپی زبانوں کی کتابوں کو علاحدہ شعبوں کی حیثیت سے متعارف کیا گیا۔ اس کے علاوہ شعبہ مخطوطات کو میر عثمان علی خان کے عہد میں نہ صرف اہمیت حاصل ہوئی بلکہ اسی عہد میں مخطوطات کی فہرست سازی کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے قلمی کتابوں کے بارے میں عام انسانوں کو واقفیت حاصل کرنے کا موقع دستیاب ہوگیا۔ کتب خانہ آصفیہ کے بعد دوسرے بڑے کتب خانے کی حیثیت سے سٹی کالج لائبریری کو اہمیت حاصل تھی اس کتب خانے میں موجود بے شمار نادرو نایاب کی فہرست بھی شائع کی گئی تا کہ عام استفادہ کا ماحول پیدا ہو سکے۔ دورِ عثمانی میں علمی ماحول کو فروغ دینے میں جہاں سرکاری سرپرستی کو اہمیت حاصل ہوئی وہیں خانگی سطح پر بھی علمی ماحول کو وسعت دینے پر خصوصی توجہ دی گئی اس خصوص میں پروفیسر سید محی الدین قادری زور کی جدو جہد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے اپنی ذاتی دلچسپی کے ذریعہ ۱۹۳۸ء میں ''ادارہ ادبیات اُردو'' کے قیام کے ذریعہ کتب خانہ اور عجائب گھر کی بنیاد رکھی اور اس ادارے کو بھی میر عثمان علی خان کی سرپرستی حاصل رہی۔ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع شدہ کتب اور اس ذاتی کتب خانے میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ قلمی کتابوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ اس عہد میں کتب خانوں میں موجود مطبوعہ کتابوں اور قلمی کتابوں کی فہرست بھی شائع کی جاتی تھی جس کا مقصد یہی تھا کہ علم سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو اس کی من پسند کتاب تک پہنچنے کا موقع دستیاب ہو جائے۔ یہی وہ علمی طریقہ تھا جسے میر عثمان علی خان کے دورِ حکومت میں اختیار کیا گیا۔ اسی دور میں ''وضاحتی کتابیات'' اور ''قلمی کتابوں کی فہرست'' شائع کرنے کا رواج عام ہوا چنانچہ ''کتب خانہ آصفیہ''، ''ادارۂ ادبیات اُردو'' اور ''کتب خانہ سالار جنگ'' کے مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں مطبوعہ طور پر عوام کے سامنے آئیں جن سے تحقیقی علمی ماحول پیدا کرنے میں سہولت حاصل ہوئی۔

میر عثمان علی خان کے دور میں قائم شدہ کتب خانوں کی فہرست مرتب کرنا سخت دشوار ہے لیکن قدیم کتابوں میں موجود حوالوں سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ کئی شخصی کتب خانے بھی اس عہد میں علم کی روشنی کو بڑھانے کے علمبردار ہو گئے تھے ایسے ہی اہم کتب خانوں میں ''حیدری گشتی کتب خانہ'' کا شمار ہوتا ہے اور اس کتب خانے کے ذریعہ ایک علمی رسالہ بھی شائع کیا جاتا تھا بلاشبہ یہ تمام کام اس وجہ سے اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کی بنیاد کتب خانہ آصفیہ کے طرز پر رکھی گئی تا کہ عوامی استفادے کی صورت پیدا ہو جائے اور کتب خانوں سے وابستہ ہو کر عام انسان اپنے علم کی پیاس بجھانے کے لئے سازگار ماحول پیدا کر لے۔ (جاری)

ایم۔آئی۔ساجد، جرمنی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی۔ایک تاثر

ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہ منافقتوں کا معاشرہ ہے۔ ہمارے سیاست دان جھوٹ بولتے ہیں۔ ہمارا ٹی وی اور ریڈیو جھوٹ نشر کرتا ہے اور اخبار زیادہ تر جھوٹ بکتے ہیں۔ اور ایسے معاشرے میں ایک ادیب کے کاندھوں پر سچ کی ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا لیکن تخلیق کار انجانے میں یہ ذمہ داری قبول کر لیتا ہے۔ اس لئے کہ تخلیق ہی سب سے بڑی سچائی ہے اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی انہیں تخلیق کاروں میں سے ایک ہیں جن کا کمٹ منٹ کسی نظریئے یا تحریک سے نہیں اپنے فن سے ہے اس کا ثبوت ان کی وہ کتب جن میں وہ فن کی بلندیوں پہ نظر آتے ہیں میں موجود ہے۔ ڈاکٹر ہرگانوی کی ہر کتب ایسے افراد کی کہانیاں ہیں جو اسی معاشرے میں پیدا ہوئے اور اسی معاشرے میں پروان چڑھے۔ یہ تحریریں ٹوٹتے انسانی رشتوں کی کہانیاں ہیں کچھ تو اپنے وطن سے دور دیارِ غیر میں جا کر بس گئے اور کچھ ایسے خاندان جو اپنے آپ سے بچھڑ گئے نظر آتے ہیں۔ یہ تمام کتابیں جواب تک منظر عام پہ آچکی ہیں ان میں تمام کردار ہمارے معاشرے کے جیتے، جاگتے، روتے، ہنستے، جبر کرتے، جبر سہتے کردار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے چھوٹی چھوٹی باتوں خواہ کسی فنکار کی معمولی خوبیاں ہوں انہیں فنکارانہ مہارت سے پینٹ کیا ہے۔

آپ کی سب کتابوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور انسانی نفسیات کو سمجھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ آپ کی زبان بہت سادہ لیکن دل کو چھو کر گزرتی ہے۔ آپ صرف سچ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں آپ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اس لئے انہوں نے اس معاشرے میں درپیش مسائل کے حوالے سے بہت ہی تیکھے انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے بلاشبہ تمام کتب میں مشاہدات و تجربات اور فنکارانہ اظہار کر کے بہت خوبصورت کتابیں لکھی ہیں آپ کی کتب میں احساس کا شدت سے اظہار پایا جاتا ہے۔ آپ کی ہر کتاب ان کی آنکھ سے اُن کے دل میں اترتا ہوا وہ آنسو ہے جو نظر نہیں آتا۔ آپ بلاشبہ ایک قدآور اصحاب میں شامل ہیں وہ جہاں سے بھی گزرتے ہیں اپنے نقوش چھوڑ جاتے ہیں اور یہ کام آج کے دور میں آسان نہیں۔!

مقصود الٰہی شیخ ،انگلینڈ

شرعی مسئلہ

یہ چار بھائیوں تسلیم، سلیم، کلیم اور علیم سے زیادہ ان کے والد صوفی صاحب کی کہانی ہے!

صوفی غلام احمد برق تپاں شاعر تو نہ تھے مگر انہوں نے اپنے بیٹوں کے نام بڑے شاعرانہ رکھ چھوڑے تھے۔ مذہبی حلقوں میں وہ اپنے بیٹوں کے ناموں کی وجہ سے ہی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے کہ ایسے نام تو کوئی عالم فاضل ہی رکھ سکتا ہے۔ واہ! کیا عالمانہ نام تھے......

تسلیم الدین سلیم، سلیم الدین کلیم، اور کلیم الدین علیم۔

صوفی غلام احمد برق تپاں کے چوتھے بیٹے کے نام کا قافیہ ضرور بدل گیا تھا مگر صوفی صاحب نے کبھی یہ اقرار نہ کیا کہ یہ نام رکھنے میں اپنے حلقۂ احباب سے مشورہ کیا تھا یا اپنے ہم وطن دوست امجد باوہاب کا آدھا نام اڑالیا ہے۔ ان کی ایک بیٹی بھی تھی۔ اس کا نام رکھا تو ہوگا مگر کوئی نہیں جانتا تھا۔ صوفی صاحب کا کہنا تھا کہ بیٹی پرایا دھن، آج نہیں تو کل شوہر کے گھر چلی جائے گی اور وہیں رل مل جائے گی...... صوفی صاحب کے چوتھے برخوردار کا نام تھا......علیم الدین باوہاب

اصل حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے ''ان دنوں'' عرب کی ایک مذہبی تحریک کے قائد محمد بن عبدالوہاب کے حالات زندگی کا مطالعہ شروع کر رکھا تھا۔ جب وہ اپنا مطالعہ کا نچوڑ یا ناظرہ اختصار دوستوں کے حلقے میں بیان کرتے تو ان کا کوئی نہ کوئی منہ پھٹ یار کہہ دیتا کہ صوفی صاحب گئے کام سے......ان پر وہابیت کا اثر غالب آرہا ہے۔ کوئی دن میں یہ وہابی ہو جائیں گے۔ مگر،

صوفی غلام احمد برق تپاں پکے سنی تھے۔ وہابیوں سے تو ان کا کبھی میل جول رہا ہی نہ تھا۔ عبدالوہاب کے حالات زندگی پڑھنے سے پہلے بھی وہ مزاروں پر جانے سے پرہیز کرتے تھے۔ نذر نیاز پر کبھی ایک پنس خرچ نہ کیا۔ تعویذ گنڈے سے دور ہو چکے تھے۔ وہاں تیجے یا باری کے بخار کے دفع کے لئے صبح فجر کے وقت ناخن لکھ دیا کرتے تھے۔ اپنے والد کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے۔ انہیں پوشیدہ ولی بتاتے اور ان کی کرامات سنی مولویوں کے لب ولہجہ میں بیان کرتے۔ پختہ عادت تھی کہ نئے ملنے والوں سے تعارف کے بعد مصافحہ کر کے دونوں ہاتھ سینے تک ضرور لے جاتے رسول کا نام آتے ہی دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے جوڑ کر چومتے اور آنکھیں بند کر کے پپوٹوں پر پھیرتے تھے۔ ہر بزرگ کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کہنا اور شریف کا لاحقہ لگانا بالکل نہ بھولتے۔ اس سلسلے میں ہرگز کوتاہی نہ کرتے۔ اگر جدہ شریف کہتے تو ٹھٹھہ شریف بھی کہتے۔

ایک بار، ان کے دوستوں کو، ان پر شیعت کا گمان بھی ہو گیا تھا۔ وہ یوں کہ بیٹھے بیٹھے، ایک روز انہوں نے سنی شیعہ اتحاد کا پرچار شروع کر دیا۔ سپاہ صحابہ کشتوں کے پشتے لگا رہی تھی اور انہوں نے شیعہ لوگوں کو عین مسلمان کہنے اور سمجھنے کی مہم شروع کر دی۔ ایک دو سٹر ملاؤں نے ان پر تشکیک پھیلانے کا الزام بھی دھر دیا

حالاں کہ صوفی غلام احمد برق تپاں نے ایک روز بھی جارحانہ انداز میں ایسی ویسی بات نہ کی تھی۔ وہ تو بڑی معصومیت سے اپنے سنی بھائیوں سے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے ہی سنیوں میں تھے، صرف یہ سوال پوچھتے ''کہئے آپ کی حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کیا رائے ہے؟ وہ بڑے سکون سے جواب کا انتظار کرتے۔ امام صاحب کے بارے میں ہر کسی سے ایک ہی جواب ملتا کہ بڑے سچے، عابد، پرہیز گار اور پاکیزہ کردار بزرگ تھے۔ پل نہ گزرتی کہ صوفی صاحب بڑے تصدیقانہ انداز میں سر ہلا ہلا کر کہتے'' کیا شک ہے۔

امام زین العابدین جنہیں ہم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہہ سکتے ہیں، شیعہ انہیں علیہ السلام کہتے ہیں، بات بیچ میں چھوڑ کر مخاطب سے پوچھتے ''آپ کو عربی آتی ہے؟'' ظاہر ہے عربی سے تمام حاضرین نابلد ہوتے تھے۔ صوفی صاحب اطمینان سے بیان جاری رکھتے ''تینوں القابات کا مطلب ایک ہی ہے۔ اللہ کی رحمت، اس کی رضا اور سلامتی، تو وہ یعنی امام صاحب اپنے نانا کی پیروی میں بڑے ہی محتاط ہوتے ہوں گے۔ گھر کا جیسا ماحول ہوگا اسی طرح وضو کرتے ہوں گے، کیا نہیں؟''

یہ اختلافی مسئلہ تھا مگر صوفی صاحب کے استدلال کا انداز دیکھ کر سامنے والا چپ کا چپ رہ جاتا۔ وضو تو سبھی کرتے ہیں لیکن کون بتا سکتا ہے کہ وضو کا طریقہ کون سی کتاب یا حدیث میں درج ہے؟ یہاں سے صوفی صاحب حوصلہ پا کر بات آگے بڑھاتے ''میں نے تو تاریخ کی کسی کتاب میں نہیں پڑھا کہ امام صاحب نے نماز وسنت یا وضو کے طریقہ میں فلاں تاریخ یا فلاں سن میں تبدیلی کے لئے کہا ہو؟ تحقیق کی گنجائش ہے۔ امت کے اتحاد کے لئے تھوڑی تحقیق کر لی جائے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا طریقہ اپنا لیا جائے تو شیعہ سنی اختلاف ختم ہو جائے گا...... کیا نہیں؟'' پھر صوفی غلام محمد برق تپاں خود ہی نتیجہ نکالتے اور کمال مہارت سے گفتگو کی سنجیدگی کو لطیف سا مزاح کا رنگ دیتے ہوئے خود کو شیعت کے الزام سے بھی بچا لیتے ''بھئی ہم حقیر، گناہگار، بزرگوں کے پیروں کی خاک'' یہاں شعری ٹوٹا لگاتے ''ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں؟ روایت پرست کہو، تقلید کرنے والے مقلد کہو یا سیدھی سادھی زبان میں یہ کہہ لو کہ ہم تو سنی سنائی پر چلتے ہیں۔ اکثریت کو غلط کیسے کہیں گے؟ اس کے ساتھ ہی صوفی صاحب کی گفتگو کا رخ اسلامی جمہوریت کی طرف مڑ جاتا۔ اگر احساس ہوتا کہ ان کی بات چیت سے کسی طرح کی معمولی سی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے تو ایک واقعہ سنانے سے بھی نہ چوکتے۔

یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے بیچ بیچ میں قہقہے لگانے کا بھی اہتمام کرتے۔ ان کے ایک دوست یا عزیز سمجھ لیجئے ایسے قریبی تعلقات والے صاحب تھے جن کے غم اور خوشی میں شرکت سے عذر ہو ہی نہیں سکتا تھا، ان کے یہاں چہلم تھا۔ انتظام امام باڑے میں کیا گیا تھا۔ صوفی صاحب وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ جب سب لوگ نماز، دعا وغیرہ کے لئے کھڑے ہوئے تو یہ بھی ساتھ دینے لگے۔ اتنی بات کر کے وہ چبا چبا کر کہتے ''انہیں یاد نہیں آ رہا کہ اس وقت باوضو تھے یا نہیں۔ شاید گھر سے کر کے چلے ہوں گے ورنہ امام بارگاہ میں وہی سوال پیدا ہو جاتا کہ پہلے پیر دھونے جائیں یا سنیوں کی طرح ہاتھ؟'' صوفی صاحب سنجیدہ ور نجیدہ صورت

بنا کر فرماتے ''دراصل ماحول اتنا غمناک تھا کہ میں مرعوب ہو گیا اور پھر سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی؟'' اس کے بعد صوفی صاحب قہقہہ لگاتے، قہقہہ روکتے اور فرماتے ''عملاً یہ ہوا کہ وہ لوگ یعنی ہمارے شیعہ بھائی تو گئے سجدے میں (قہقہہ) اور میں قیام سے رکوع میں۔ جب معلوم ہوا کہ رکوع نہیں کیا گیا یا مجھ سے نکل گیا تو میں سجدے میں چلا گیا (قہقہہ) جناب جی! میں سجدے میں اور وہ بغیر سلام پھیرے کھڑے ہو گئے (قہقہہ) دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے'' صوفی صاحب چوطرفہ نظر دوڑا کر اردگرد چہروں کے تاثرات کا اندازہ کرتے اور بیان جاری رکھتے ''میں نے زندگی میں ایسی نماز نہیں پڑھی تھی۔''

حاضرین کو کیا معلوم کہ صوفی صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟ کئیوں نے تو عید کے موقعہ پر بھی نماز نہ پڑھی تھی۔ دو دو عیدیں ہونے لگیں تھیں۔ جس کے ساتھ عید مناتے اسی فرقہ کا ٹھپہ لگ جاتا! کسی کو فکر نہ تھی کہ صوفی صاحب جو کہہ رہے ہیں وہ درست ہے یا سرے سے غلط ہے۔ بس، صوفی غلام احمد برق تپاں کا انداز بیان ہی ایسا تپا تپایا ہوتا تھا کہ سب دلچسپی سے سنتے اور بعض ان کے ساتھ قہقہے بھی لگاتے۔

ایک زمانے میں صوفی صاحب نے اپنے آپ کو آزاد خیال مسلمان مشہور کر رکھا تھا۔ ان کے ملنے والوں کی اکثریت کا اتفاق اس بات پر تھا کہ ان کا پورا گھرانہ آزاد خیال ہے۔ صوفی صاحب صفاچٹ تھے۔ داڑھی مونچھ سے آزاد لیکن چاروں بیٹوں نے خشخشی داڑھیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہروں پر اچھی بھی لگتی تھیں چاروں بھائیوں نے اپنی مرضی سے انگریز لڑکوں سے شادیاں کر رکھی تھیں۔ بعض ہمسائے کہتے تھے کہ اسی وجہ سے صوفی صاحب اپنے تئیں آزاد مسلمان کہنے لگے ہیں اور یہ کہ صوفی صاحب احتیاطاً کسی بیٹے کی شادی میں شریک نہیں ہوئے۔ عام خبر گرم تھی کہ بچوں نے والدین سے اجازت لئے بغیر شادیاں کی ہیں۔ کہیں سوال اٹھتا تو صوفی صاحب دوسری ہی حکایت سناتے۔ بڑے زور و شور سے فرماتے کہ انہوں نے چاروں بہوؤں کو خود مسلمان کیا تھا۔ بڑے دعوے سے کہتے کہ کلمہ شریف خود انہوں نے پڑھوایا تھا۔ ثبوت میں کہتے ''چاروں بہوؤں کی زبان موٹی تھی۔ عربی کلمہ پڑھنے سے قاصر تھیں۔ کوشش کی کہ اردو میں اقرار کروالوں۔ اس میں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ساری عمر کفر میں گزری ہو تو یہی ہوگا۔ آخر چاروں کو ساتھ بٹھا کر کلمہ شریف کا انگریزی ترجمہ سنایا، سمجھایا اور انگریزی میں تصدیق کرا لی۔'' صوفی صاحب کے منہ کون لگتا۔ سننے والے خاموش رہتے۔ اس پر صوفی غلام احمد برق تپاں مزید اضافہ کرتے ''میں مطمئن میرا خدا گواہ۔ چاروں لڑکیوں نے اقرار باللسان کے ساتھ ساتھ اقرار بالقلب کر لیا ہے۔ چاروں پکی مسلمان ہیں۔ کسی کو ان کے ایمان پر شک کرنے اور زبان دراز کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ یہ بھی سنا چکے تھے کہ ان کی حیات میں کوئی فوت ہوئی تو وہ اس کا باقاعدہ جنازہ کرا کے دفنائیں گے۔ وہ یہ وضاحت کرنی کبھی نہ بھولتے کہ مسلمان ''کتابیہ'' سے شادی کر سکتے ہیں البتہ مسلمان عورت اسلام سے باہر شادی نہیں کر سکتی۔ یہ حکم الٰہی ہے۔

جب صوفی صاحب کے یہاں پہلا پوتا ہوا تو بڑی دھوم دھام ہوئی۔ بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا گیا۔ یہ اعلان بھی ہوا کہ شہر کے پہلے مسلم سنٹر میں اسی روز عقیقہ اور ''مسلمانیاں'' ہوں گی۔

لڑکے یعنی نومولود کے عقیقے کے جانور کٹنے کے بعد جب صوفی صاحب چاروں بیٹوں کے ساتھ گھر آئے تو ان کے ہمراہ ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب بچوں کے ختنہ کے ماہر اور علاقہ بھر میں مشہور تھے اور دعاء کے لئے مولوی صاحب بھی آئے مگر نومولود کی والدہ نے ''رپھڑ'' ڈال دیا کہ وہ اتنی سی ننھی جان پر کسی قسم کا چھری چاقو استعمال نہیں کرنے دے گی۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس وقت نہ تھا۔ اس روز انہیں بارہ بچوں کو ختنہ بٹھانا تھا اس لئے چلے گئے۔ پرانے ملنے والے تھے، جاتے ہوئے کہہ گئے جب آپس میں تصفیہ ہو جائے تو ان کو بلالیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ رعائت بھی کی کہ اس نازک وقت پر فیس کا سوال نہ اٹھایا۔ شہرداری تھی، واقفیت تھی۔ صوفی صاحب نے سبکی مٹانے کو مولوی صاحب کو اشارہ کیا۔ مولوی صاحب انگریزی میں بھی وعظ کر لیتے تھے چنانچہ وہاں گھر والوں کے علاوہ حاضر مرد و خواتین کے عام افادے کے لئے، مولوی صاحب نے، ختنہ سے متعلق مختصر سا وعظ دیا اور امت کا مسلمہ مسلک بھی بیان فرمایا مگر نومولود کی والدہ رضامند نہ ہوئی۔ اس نے بحث کے دوران اپنے پاکستانی لباس کی جدید فیشن کی قمیض کے سامنے کے بٹن کھول کر بچے کو دودھ پلانا شروع کر دیا۔ مولوی صاحب گڑبڑا کر اٹھے، مجوزہ ناموں کی فہرست جیب میں جلدی سے ٹھونسی، کاندھے پر پڑا رومال منہ پر ڈھالا اور اپنا رخ پھیرلیا۔ دوسری طرف صوفی صاحب کھڑے تھے، ان سے نقاب ہٹا کر رخصت کی اجازت طلب کی اور کہا نام بھی سنٹر میں رکھ کر دعا کرا لیجئے گا۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر وہاں آپ کے انگریز دوست بھی ہوں۔ دعا پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔

صوفی صاحب تھوڑا سراسیمہ ہو رہے تھے مگر حسب عادت فضا خراب ہونے سے بچانے کے لئے گھر والوں سے کہا ''ہال میں چلنے کی تیاری پکڑیں۔ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر مسلمان ہونے کی بنیاد ہو۔ وہ خود مادرزاد مسلمان پیدا ہوئے تھے۔ ان کے چاروں بیٹے بھی قدرتی طور پر ویسے ہی تھے۔'' اس پر مسز صوفی بھڑک اٹھیں۔ انہوں نے صوفی صاحب کو ڈانٹ کر کہا ''میں آپ کی شہادت نہیں دے سکتی مگر چاروں بچوں کے عقیقے بھی ہوئے اور ختنے بھی...... آپ جوش بیان میں سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔'' صوفی صاحب نے پہلے اتنی سبکی محسوس نہ کی تھی اب تو باقاعدہ طیش میں آگئے۔ قریبی میز پر زور کا ہاتھ مارا اور سبھوں کو خاموش کراتے ہوئے کہا ''اسلام میں سب سے زیادہ اسی بات سے منع کیا گیا ہے۔ آپس میں نااتفاقی نہیں ہونی چاہئے۔ کیوں مولوی صاحب؟'' بچارے مولوی صاحب نے اثبات میں سر ہلایا تو صوفی صاحب نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھا دیا مولوی صاحب بغیر لئے دئے چلے گئے۔ کیا کرتے؟ صوفی صاحب کا غصہ ابھی دھیما نہیں پڑا تھا، رعب دار آواز میں حکم دیا'' ہال میں سب لوگ وقت پر پہنچیں۔ چھوٹی موٹی باتوں پر بحث بند کرو۔ ہم اول آخر مسلمان ہیں۔ کوئی ہمیں ایسی فضول، حقیر اور فروعی باتوں پر دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کر سکتا۔

ایسے موقعوں پر عورتوں کی تیاری میں وقت لگ ہی جاتا ہے چنانچہ جب صوفی فیملی مسلم سنٹر پہنچی تو مہمانوں کی اچھی خاصی تعداد جمع تھی۔ صوفی صاحب بات بے بات کھول رہے تھے اور بے قابو ہو ہو جاتے تھے۔ اس کے باوجود جب کوئی مہمان آتا تو خندہ پیشانی اور لبوں پر مسکراہٹ لا کر خوش چہرگی کے ساتھ استقبال

کرتے۔ اتنے میں ایک نوعمر لڑکی اور اور اس کے ہمراہ ایک انگریز بھی بے دھڑک اندر آ گیا۔ شاید صوفی صاحب کی نظر نہ پڑی ہوگی ورنہ دوڑ کر دروازے پر جاتے اور تپاک سے اگلی سیٹوں پر لا کر بٹھاتے۔ ہال میں، ان کی بہوؤں کے علاوہ کئی انگریز خواتین پاکستانی لباس پہنے ہوئے تھیں۔ مگر حجاب ڈالے ہوئے اس لڑکی کے ساتھ اندر آنے والا انگریز بھی پاجامے شیروانی میں سج رہا تھا۔ چہرے پر صوفی صاحب کے بیٹوں ایسی ہلکی ہلکی داڑھی بھی اس پر سج رہی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے معتبر اور خوش لباس توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک سے مل کر اسلام علیم کہتا اور نام عبدالقیوم بتا کر اپنا تعارف بھی کراتا۔ صوفی صاحب کے قریب پہنچا تو لگا گلے ملے گا مگر صوفی غلام احمد برق تپاں نظر بچا کر طرح دیتے ہوئے تیزی سے مڑے اور معمولی سے فاصلے پر حجاب پہنے ہوئے جو لڑکی کھڑی تھی اس سے اپنا پوتا چھینتے ہوئے لچکچاتے ہوئے دیکھے گئے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پا رہے تھے۔ پھر بھی نزدیک کے لوگوں نے سن لیا ''اپنے گورے کو لیکر نکل جاؤ۔ یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ۔ تم ہم میں سے نہیں ہو۔'' جن مہمانوں نے یہ منظر دیکھا اور سنا، وہ حیران رہ گئے۔ ایک بڑی عمر کی خاتون نے کسی قدر بلند آواز جو صوفی غلام احمد برق تپاں کے کان یقیناً پڑی ہوگی، میں کہا ''آ ہی گئی تھی تو بیٹی کے ساتھ یہ سلوک اور داماد کے ساتھ یہ برتاؤ مناسب نہ تھا۔'' ساتھ والی خاتون بولی ''انگریز ہے تو کیا؟ سنا ہے پکا مسلمان ہے۔ پنج وقتہ نمازی بھی ہے۔'' ☆

عفت موہانی، حیدر آباد

بے درد

وہ ایک گوشے میں کھڑی اس لڑکی کو مسلسل گھور رہا تھا۔ کانووکیشن کا جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ لڑکے لڑکیاں ہنستے قہقہے لگاتے ہال سے باہر نکل رہے تھے۔ ایسے پر شور ماحول میں کون دھیان دیتا کہ کون کسے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کو شاید خود بھی احساس نہ تھا کہ وہ قابل اعتراض نگاہوں کا ہدف بنی ہوئی تھی۔ لہٰذا اس کے مسلسل گھورنے میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ اسے وہ نسائی چہرہ بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اسے جھپٹ لے۔ فی الحال نظروں ہی سے اسے کھائے لیتا تھا۔ مگر اس کی لمحاتی محبت پر بجلی گر پڑی۔ بے چاری میری طرح لنگڑا رہی تھی۔ شاید پاؤں مڑ گیا تھا تبھی تو ایک طرف جھک کر چلنے پر مجبور تھی، پھر احتشام کا جذبۂ محبت ہمدردی میں ڈھل گیا، خدایا کیا ہوگا بے چاری کا صورت ایسی مگر ایک جسمانی عیب، جس نے صورت کا تاثر بھی زائل کر دیا تھا۔

پھر احتشام کو پتہ چلا وہ گریجویشن کر رہی تھی، اور ایک اچھی قلمکار بھی تھی۔ لیکن اس کی تحریر میں ایک درد پنہاں ہوتا تھا۔ یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا کہ بے چاری کو اپنے عیب کا احساس تھا اور یہی احساس ایک کراہ بن کر اس کی تحریروں میں نمایاں ہو جاتا تھا۔

احتشام نے اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرلیں، ایک دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ بہت ذہین اور تیز طالب علم تھی۔ پھر کچھ اور معلوم ہوا۔ اس کے باپ نے لڑکی کی شادی کے لئے بڑے ترغیب آمیز جہیز کا اعلان کر رکھا تھا۔ خوب صورت سجا سجایا فلیٹ، امپورٹڈ کار، پانچ لاکھ نقد، لیکن اختر نے صاف انکار کر دیا تھا۔ عارف اپنی منگنی کا بہانہ کر کے الگ ہو گیا تھا۔ جاوید کسی ڈگری کے لئے امریکہ جا رہا تھا۔ بہر حال لڑکی سے وابستہ گرانقدر، جہیز بھی کسی کو متاثر نہ کر سکا۔ احتشام کو بہت صدمہ ہوا۔ کیا بے چاری یونہی عمر گزار دے گی۔ اس نے اپنے دوست سے اپنی کوفت اور ساتھ ہی اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔

ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ ایک اچھی قلمکار ہے۔ ایک معقول ترین جہیز لائے گی۔ پھر آخر یہ لالچی لڑکے کنارے کیوں ہو گئے۔ جسمانی عیب کوئی خاص بات نہیں۔ مجبوری ہے۔ گوارہ کر لینا چاہئے۔"

جمیل خوش ہو گیا۔ "تمہارے خیالات بڑے اونچے ہیں۔ سن کر خوشی ہوئی، عذرا سنے گی تو اسے بھی بے حد خوشی ہوگی۔ عذرا نام ہے؟

ہاں! نام بھی اچھا خاصا خوب صورت ہے۔ تم اس سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہو۔

جب سے دیکھا ہے مسلسل اسی کے بارے میں سوچ جا رہا ہوں۔" احتشام نے اعتراف کیا۔

ہاں بھئی۔ ایک معقول تسلی آمیز تقریر بھی دل ہی دل میں تیار کر لی ہے۔ مگر اس سے بات چیت کرنے کا کوئی موقعہ ہی نہ ملا۔ کیا کہتے اس سے۔ جمیل بھی بے چاری کا ہمدرد ہی لگ رہا تھا۔

"یہی کہنا کہ اپنی جسمانی کمزوری کو اپنے فن پر حاوی ہونے نہ دے۔ بہت سے گزرے ہوئے لوگ کوئی نہ کوئی عیب رکھتے تھے۔ مگران لوگوں نے اپنے نقص کو اپنے قلم پر حاوی نہ ہونے دیا۔ مثلاً عربی شاعر درجل نابینا تھا۔ ملٹن بھی نابینا تھا۔........ نہایت بدصورت تھا اور لارڈ بائرن بھی لنگڑا ہی تھا۔ مگر اس کا لنگڑا پن ایسا دلکش تھا کہ اس کے پرستار بائیرن کی طرح لنگڑا کر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ اب یہ سارے مشہور لوگ اپنے جسمانی عیب سے متاثر نہ تھے۔ بس اپنے فن کی آبیاری کرتے رہے۔ آج دیکھو کہ ان کا کیا مقام ہے۔ زندہ جاوید ہیں۔"

"ارے یار تم تو تاریخی حوالوں سے اسے حوصلہ دے سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ بے چاری بہت متاثر ہوگی۔ تم اس سے مل کر اسے کیوں نہیں سمجھاتے۔"

سوچتا تو یہی ہوں۔" احتشام نے کہا، لیکن بعض لوگ دوسروں کی ہمدردی اور خلوص کا بھی الٹا مطلب نکال لیتے ہیں۔ اگر وہ بگڑ گئی تو اپنا سا منہ لے کے رہ جاؤں گا۔"

اس میں یہ ذرا سا جسمانی نقص نہ ہوتا تو کیا بات تھی۔ پڑھی لکھی ہے گریجویشن کر رہی ہے۔ اچھی قلمکار ہے اور پھر اس کے نام ایسا معقول جہیز، پانچ لاکھ نقد" جمیل نے کہا۔

جہیز اور نقد پانچ لاکھ کا کیا۔ ایک نہ ایک دن تو لاکھوں روپے آخر ختم ہو ہی جائیں گے۔ احتشام نے کہا۔ ایک مشورہ دوں تمہیں؟ جمیل کچھ سوچ کر مسکرایا۔

کیا مشورہ ہے؟ احتشام کچھ چوکنا سا ہو گیا۔

تم اس سے اتنے متاثر ہو۔ اس کی تعریفیں کر رہے ہو۔" جمیل کہہ رہا تھا" اس سے اتنی ہمدردی رکھتے ہو۔ کیوں نہ تم ہی اس سے شادی کر لو۔ بے چاری کی زندگی بن جائے گی۔

یک بیک احتشام کے نرم ولطیف محسوسات پر نفرت وغصہ کے جذبات غالب آگئے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ کرسی سے اٹھتا ہوا بولا۔

"لعنت بھیجو یار۔ ایک لنگڑی پر بھینٹ چڑھنے کے لئے کیا میں ہی رہ گیا ہوں؟"
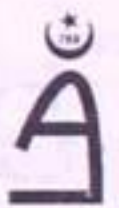
حسن اجھریلوی (محمد ابوالحسن)، ایس ڈی ایم، بینی پٹی

ناممکن

اُس کے قدم تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ دراصل اسے راستے کا کچھ خیال ہی نہیں تھا۔ ہاتھ میں بریف کیس لے کر وہ اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا اور اپنے ذہن میں بیتی زندگی کے اوراق اُلٹ رہا تھا۔ معاً وہ بڑبڑایا۔

''کیا مجھ سے ناقابل معافی خطا سرزد ہوئی ہے؟ کیا میں اس خطا سے اپنا دامن بچا سکتا تھا؟ نہیں .... ہرگز نہیں۔'' کہتا ہوا وہ آگے بڑھتا گیا۔

خلیق ایک گاؤں میں ایک معمولی کسان کے گھر پیدا ہوا تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی اسے غربت و افلاس کے نظارے دیکھنے کو ملے تھے۔ اس کا کنبہ نسبتاً پڑوس کے کنبوں سے نہ صرف بہتر تھا بلکہ دوسرے کسانوں سے زیادہ خوش حال سمجھا جاتا تھا۔ گھر میں تعلیم کا ماحول قطعی نہ تھا۔ لیکن خلیق کی طبیعت فطری طور پر بچپن ہی سے تعلیم کی طرف مائل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے شوق اور محنت رنگ لاتے رہے۔ اس کا حوصلہ بڑھتا گیا۔ اپنے درجوں میں اس کا مقام ہمیشہ دوسرے طالب علموں سے ممتاز رہا۔ اس کا حوصلہ رفتہ رفتہ عزم کی صورت اختیار کرتا گیا۔ تعلیم کے دوران خلیق بارہا مصائب کا شکار بھی ہوا۔ تاہم اس کا عزم پختہ رہا۔ یہاں تک کہ اس نے بی۔ اے کے بعد بے سروسامانی کے عالم میں ایم۔ اے کی ڈگری بھی نمایاں حیثیت سے حاصل کر لی۔ اور لوگوں کو حیرانی میں مبتلا کر دیا۔

ڈگری تو خلیق نے اپنی محنت اور ذہانت کے بل بوتے پر حاصل کر لی تھی مگر اس کے پاس کوئی سفارش نہ تھی۔ کافی دن بیکاری کے عالم میں اُس نے بڑے ہی صبر و تحمل کے ساتھ گزارے۔ مگر کبھی کبھی وہ مایوس ہو جاتا اور سوچا کرتا۔ ''کیا اللہ کے یہاں انصاف نہیں ہے؟''

اس کا ضمیر کہتا ''انصاف ہے اور ضرور ہے۔ اللہ کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔''

دراصل وہ اتنا حساس تھا کہ کسی حال میں اپنی خودداری پر حرف نہیں آنے دیتا تھا۔ آخرکار بڑی جدوجہد کے بعد اسے ایک دفتر میں معمولی کلرک کی ملازمت مل گئی۔ ''چلو کچھ تو راحت ملی۔''

اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اور صبر و شکر کے ساتھ زندگی کے سفر کو طئے کرنے لگا۔

ملازمت ملنے کے بعد خلیق کے سامنے رہائش کے لئے ایک کمرے کا مسئلہ آ کھڑا ہوا۔ کمرے ہی کی تلاش کے دوران اس کی ملاقات روشن علی سے ہوئی جو ایک خوش اخلاق اور خوش حال شخص تھے۔

''بھائی صاحب اس شہر میں مکانوں کی بڑی قلت ہے۔ مجھے تو صرف ایک چھوٹے سے

کمرے کی تلاش ہے۔ سنا ہے، وہ آپ کے پاس دستیاب ہے۔ اگر گنجائش ہو تو ...... بڑی مہربانی ہوگی۔'' خلیق نے بڑی امید کے ساتھ روشن علی سے درخواست کی۔

کچھ اپنی غرض کی خاطر اور کچھ اس نوجوان مفلس کے حال پر ترس کھا کر روشن علی نے اپنے رہائش مکان کا ایک کمرہ خلیق کو رہنے کے لئے یہ کہتے ہوئے دے دیا۔ ''بھائی، کمرہ تو کرایہ کے لئے نہیں رکھا تھا۔ لیکن آپ کی مدد کی خاطر دے رہا ہوں۔ اپنا گھر سمجھ کر ہی رہئے۔''

''جی، بہت بہت شکریہ!! انشاءاللہ اپنی جانب سے کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' خلیق نے راحت کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

خلیق کو کمرہ ملتے ہی مکان مالک اور پڑوس کے کرایے داروں کے اخلاق سے بڑی تشفی ہوئی اور اس کے دل کو سکون ملا۔ بذاتِ خود خلیق بھی فطری طور پر ملنسار اور خوش اخلاق واقع ہوا تھا۔ اب اس کی زندگی تنگی کے باوجود سکون کے ساتھ گزرنے لگی۔ روشن علی کے مکان میں اگرچہ اس کی حیثیت ایک کرایہ دار کی تھی۔ تاہم رفتہ رفتہ خلیق اور مکان مالک کے کنبے کے افراد کے درمیان تعلقات بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ اُس نے اس کنبہ کے ایک فرد کی حیثیت حاصل کر لی۔

''بھئی، کسی دن جب آپ چلے جائیں گے، تو آپ کی کمی ہم سب کو بہت محسوس ہوگی۔'' روشن علی اکثر کہا کرتے اور خلیق مسکرا کر رہ جاتا۔

روشن علی کے چار بچے تھے۔ فرحت، روحی اور صبوحی تین بیٹیاں اور شاکر اکلوتا بیٹا تھا۔ اختری بیگم روشن علی کی بیوی تھیں۔ خلیق روشن علی کے بچوں کا اتالیق بن چکا تھا۔ اختری بیگم کے دل میں خلیق نے جگہ پیدا کر لی تھی۔ خلیق صبح وشام بچوں کو پڑھانے میں مصروف رہتا اور دن بھر دفتر کے کام میں۔ تاہم خلیق کی ملازمت کے باوجود اس کے کنبے کی مالی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ اُن کا کنبہ اکثر بلائے ناگہانی کا شکار ہوتا رہا۔ اپنے گھر سے ہزاروں کلومیٹر دور ہونے کے باوجود خلیق کے دل سے اس کے والدین اور چھوٹے بھائی بہن کی یاد کبھی محو نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے کنبے کی مدد کرنے میں کبھی کوتاہی نہ کرتا تھا۔

روشن علی کافی خوشحال اور تجارت پیشہ شخص تھے۔ اُن کے سامنے بھی کچھ ایسے مسائل تھے جو اللہ کے فضل ہی سے حل ہو سکتے تھے۔ مال وزر سے یہ مسائل حل نہیں کئے جا سکتے تھے۔ خلیق پر روشن علی بہت بھروسہ کرتے تھے۔ وہ اُن کا چھوٹا بھائی اور دوست دونوں ہی تھا۔ اس سے ہر مسئلے کا تذکرہ کر کے اپنا بوجھ ہلکا کرتے تھے۔

فرحت، روحی، صبوحی اور شاکر، خلیق کی زندگی کے انگ بن چکے تھے۔ خلیق کو اُن بچوں سے اور بچوں کو خلیق سے محبت ہو گئی تھی۔ ان بچوں کے درمیان رہ کر خلیق اپنے سارے غم بھول جاتا اور اسے روحانی مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ بچوں کی تعلیم کی خاطر اس نے اپنا آرام تج دیا تھا۔ مگر

انتہائی جدوجہد کے باوجود خلیق کو اپنی صلاحیت کے مطابق ملازمت نہیں مل سکی اوراس کی کاوش جاری رہی۔ وہ ایک کلرک کی زندگی گزارنے پر مجبور رہا۔

شاکر نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ دُور کے شہر میں رہنے لگا تھا۔ فرحت کی شادی ایاز کے ساتھ ہو چکی تھی۔ روشن علی کو خاطر خواہ داماد مل گیا تھا۔ جس کے پاس کار، بنگلہ، ٹیلی فون، جائیداد تھی۔ فرحت کی شادی کے بعد روشن علی کا ذہنی بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ دولت منداور ہم پیشہ داماد ملنے پر وہ فخر محسوس کیا کرتے تھے۔ دراصل اب ان کے خیالات پر مادیت حاوی ہو چکی تھی۔

روشن علی کے کنبے میں اب اختری بیگم، روحی، صبوحی اور خلیق رہ گئے تھے۔ روحی جوصرف نام کے لئے اسکول جاتی تھی، خلیق کی تربیت اور اپنی محنت کی بدولت وہ اپنے اندر حیران کن تبدیلی لا چکی تھی۔ وہ بلا کی ذہین ثابت ہوئی۔ خود خلیق کو اس کی ذہانت پر حیرت ہوتی تھی۔ روحی کو محنت کا شوق اور بڑھتا گیا۔ خلیق کو مزید حیرت ہونے لگی اور حسرت بھی۔ روحی کے لئے اس کے دل میں شفقت اور زیادہ بڑھنے لگی۔ روحی کے دل میں بھی خلیق کے لئے احترام انتہائی درجے تک بڑھ گیا تھا۔ صبوحی کے لئے بھی خلیق کی شفقت کم نہ تھی۔ لیکن روحی کی ذہانت، محنت نے اُسے روحی کی طرف راغب کر دیا تھا۔ روحی کے برعکس صبوحی نہایت ہی شوخ اور غیر سنجیدہ تھی۔ روحی بھی کچھ کم حساس اور شوخ نہ تھی۔ مگر شوخی کا اظہار بہت کم کرتی تھی۔ صبوحی کم عمری کے سبب والدین اور خلیق کی لاڈلی بن چکی تھی۔ روحی زیادہ محنتی تھی اسی وجہ سے خلیق روحی کی پڑھائی کا زیادہ خیال رکھتا تھا۔ خلیق اور روشن علی ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ دونوں کی دوستی کے چرچے ہوا کرتے۔ دونوں ہر محفل میں ساتھ ساتھ نظر آتے۔ خلیق کبھی آفس یا کہیں سے، دیر سے گھر آتا تو روشن علی کہتے۔ ’’بھئی، آپ کو آفس کے کام سے کہیں باہر جانا پڑے تو کم سے کم گھر پر خبر کر دیا کیجئے۔ ورنہ تشویش ہونے لگتی ہے۔‘‘ روحی کے میٹرک کا امتحان قریب تھا۔ خلیق کو روحی کے امتحان کی تیاری کے لئے محنت کچھ زیادہ ہی کرنا پڑ رہی تھی۔ خلیق اور روحی ایک دوسرے کے بہت قریب آنے لگے۔ ایک روز روحی نے خلیق سے شوخی میں پوچھ ڈالا۔ ’’سر! آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟ آپ کو کیسی لڑکی چاہئے؟‘‘ خلیق کے تن میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔

’’بالکل تمہاری جیسی۔‘‘ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

’’کیا میں پسند ہوں؟‘‘ روحی نے ہنس کر پوچھا۔

’’تم مجھ کو صرف پسند ہی نہیں بلکہ میری رگ رگ میں سما چکی ہو......‘‘ یہ سن کر روحی کا چہرہ مارے حیا کے سرخ ہو گیا۔ دونوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ روحی شرما کر آنگن میں چلی گئی اور خلیق اپنے کمرے میں۔ دونوں اپنے اپنے کمرے میں تنہائی کے عالم میں خوبصورت خواب بننے لگے۔ دوسرے روز سے پڑھائی کے درمیان اشاروں کنایوں میں ان دونوں کے درمیان محبت کی باتیں

ہونے لگیں۔صبوحی کو بھنک تک نہ ہوتی۔

روشن علی اور اختری بیگم کی نگاہ اس جانب کبھی نہیں گئی۔شاکر کبھی کبھی چند روز کے لئے گھر آتا۔وہ کافی ذہین نوجوان تھا۔اس نے محسوس کرلیا کیونکہ محبت کی خوشبو کسی بکسے میں بند نہیں کی جاسکتی۔

خلیق اور روحی ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہونے کی قسمیں کھانے لگے۔دونوں کو ایک دوسرے کے قُرب سے خوشی کا احساس ہوتا اور دوری سے غم کا۔

روشن علی کا نظریہ بدل چکا تھا۔اب وہ زیادہ مادّہ پرست ہو چکے تھے۔خلیق ہمیشہ کہا کرتا۔

''مادّے کی اہمیت بہت زیادہ ہے،لیکن پرستش کی حد تک نہیں۔''

روشن علی اپنی دلائل سے ان کے قوت کو رد کر دیتے۔

خلیق اپنے کنبے کے متعلق ہمیشہ سچ بتایا کرتا تھا۔روشن علی کو خلیق سے محبت تو ضرور تھی مگر وہ اس کے گھر کی غربت کے تصور سے گھبراتے تھے۔ان کی نگاہوں میں تعلیم،خودداری،صلاحیت، اخلاق کی قدر اتنی نہ تھی جتنی کہ کار،بنگلہ اور ٹیلی فون کی۔تاہم روشن علی خلیق کی قدر بہت کرتے تھے۔

اسی لئے گفتگو کے دوران ایک روز خلیق نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں تاحیات آپ لوگوں سے جُدا نہ ہوں۔''

روشن علی مصنوعی طور پر چونک گئے اور بولے۔''کیا مطلب؟''

ڈرتے ڈرتے خلیق نے دل کی بات زبان پر لانے کی جرأت کی۔

''میں روحی کے ساتھ......'' خلیق نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ روشن علی چیخ پڑے۔

''ناممکن''

خلیق پر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔اس کا دل چکنا چور ہو گیا اور اس کے خواب ٹوٹ کر بکھرنے لگے۔

ناچار خلیق نے شہر کو خیر باد کہہ کر دوسرے شہر میں قسمت آزمائی کی اور اپنی کوششوں کے نتیجے میں وہ ترقی کرتے کرتے ایک گزیٹیڈ آفیسر بن گیا۔دراصل ''امید کی آخری کرن'' اس کے دل میں روحی، کی طرح اب بھی روشن تھی۔اس نے اپنے آپ کو روشن علی کے معیار پر اترنے کے قابل بنالیا تھا۔اسی لئے ایک دن اپنی قسمت آزمائی کے لئے وہ روشن علی کی دہلیز تک پہنچ گیا۔اسے یقین تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں اس کا شاندار خیر مقدم ہوگا اور وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔مگر وہاں پہنچتے ہی پتہ چلا کہ روحی اس کا انتظار نہ کرسکی اور اسے کسی اور کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔

اپنا بریف کیس سنبھالے ہوئے خلیق اسٹیشن کی طرف جارہا تھا۔اسے ایسا لگ رہا تھا، جیسے اس شہر کے در و دیوار آج بھی اس پر،اس کی غربت پر،ہنس رہے ہوں۔اُن کے قہقہوں کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں اور وہ جلد از جلد ان ہنگاموں سے دُور نکل جانا چاہتا تھا۔☆

اس شمارہ کی مخصوص شاعرہ: ڈاکٹر انورؔی بیگم

ڈاکٹر انوری بیگم نئی نسل کی ایک نمائندہ فن کار ہیں جنہوں نے بیک وقت اُردو نثر و نظم دونوں کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر کے اپنی ایک شناخت بنائی ہے۔ انوری بیگم رانچی یونیورسٹی کے کوپریٹیو کالج جمشید پور (جھارکھنڈ) میں صدر شعبۂ اُردو ہیں اور ان کی تین کتابیں ''قدیم دکنی شاعری میں مشترکہ کلچر'' (تحقیق) ''کرچیاں اعتماد کی'' (افسانے) اور ''خاموش شکوے'' (نظمیں) شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی پرورش و پرداخت شہر آہن جمشید پور میں ہوئی ہے جو سائنس ٹیکنولوجی اور جدید تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے اور ان کو جدید عصری حسیت کا تحفہ ان کے ماحول ہی نے عطا کیا ہے۔ ظاہر ہے ان کی تخلیقات میں یہ شعور یوں ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ اپنے تجربات و مشاہدات کی آمیزش سے وہ اپنے اشعار کا خمیر تیار کرتی ہیں۔ ان کا کلام شگفتگی و سادگی کے ساتھ تمام شعری محاسن سے آراستہ ہے اور اپنی پہچان کی طرف گامزن ہے۔ اشعار میں تخلیقیت کا پہلو نہایت واضح ہے جس کی جھلکیاں بڑی واضح اشاریت کے ساتھ موجزن ہیں نیز ان کے مصرعوں کا در و بست اور الفاظ کا موزوں انتخاب ان کے کلام میں ایک خاص جاذبیت پیدا کرتا ہے۔ اپنے ذاتی مشاہدات کو وہ اس خوبصورتی سے پیش کرنے کا فن جانتی ہیں کہ ان کا قاری اسے اپنے دل کی صدائے بازگشت محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کے کلام میں الفاظ و تراکیب کا استعمال چست درست اور برجستہ ہے۔ الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھ کر غزل کی لطافت مجروح نہیں ہو پاتی بلکہ قاری ترسیل کے تمام مراحل سے بحسن و خوبی گذر جاتا ہے۔ ان کی دو غزلیں آپ کے پیش نظر ہیں جن سے فن اور فکر پر ان کی گرفت کا اندازہ ہر باذوق قاری کر سکتا ہے!

امام اعظم

غزلیں

(۱)

انا کی ہم پرستش میں ہیں ہم سے رحمتیں گم ہیں
وگرنہ اس جہاں میں کیسی کیسی نعمتیں گم ہیں

امیدیں ہیں کہ دروازے کبھی تو مسکرائیں گے
نگاہوں میں نہ جانے کیسی کیسی حسرتیں گم ہیں

اسی آدم کو مخلوقات میں اشرف کہا جائے
کہ خونخواروں کی جس میں کتنی ایسی خصلتیں گم ہیں

کوئی پوچھے کسی سے حال کیا گھٹ گھٹ کے جینے کا
کہ اب پاگل ہواؤں میں ہزاروں نفرتیں گم ہیں

مرا تجھ سے ہے کیا رشتہ بتا دے زندگی مجھ کو
تری مہماں نوازی میں جو میری چاہتیں گم ہیں

یہاں امن و سکوں اب خواب ہے ان کی تمنا کیا
جنونی بن گئے ہیں لوگ ان کی غیرتیں گم ہیں

زمانہ کیوں ہے آخر انورؔی انجام سے غافل
کبھی شداد کی مانند لیکر جنتیں گم ہیں

(۲)

تمنا ہے نہ لب پر اب گلہ کوئی
اگر ابھرے تو دل سے کیا صدا کوئی

نشہ فرعونیت کا سر چڑھا ہے پھر
الٰہی کردے ظاہر تو عصا کوئی

نہیں ہے دل سے دل کا رابطہ باقی
کہے کیسے کسی سے برملا کوئی

ترے وعدوں کو دھوکہ کب کہا میں نے
مگر تہمت رہی مجھ پر سدا کوئی

جہان رنگ و بو سے وہ جدا کردے
اگر جو ہے مری چاہت خطا کوئی

چمن میں چار سو مضطر رہا طائر
کبھی جب آشیاں یاد آگیا کوئی

نہ چھیڑو انوری ساز شکستہ کو
نہ ابھرے گی ابھی اس سے صدا کوئی

ش۔م۔ عارف ماہر آروی

بارہ ماسہ (قسط۔۳)

(۵) ساون

جھوم جھوم کے امنڈ امنڈ کے
کالے کالے بادل جیسے
زلف ہماری/ لہراتے ہیں آکاش پہ ہر دم
جھم جھما جھم میگھا برسے
جسے میرے نین سے گر کر
تمھیں پانی تر کر جاتے ہیں
دامن میرا/ میں ترسوں میرا تن ترسے
سمواری کا میلہ بھی/ اب تو لگنے لگا ہے
جس کو دیکھو کنیاں لیکر گھوم رہا ہے
ساتھ ہی ساتھ کا مڑیوں نے کا مڑا اٹھا کے
''بم بول'' کا نعرہ/ دے بھی دیا ہے
ہلدی جیسے پیراہن سب کے/ تن پر جیسے
حج میں مسلم اجلے وستر دھارن کر کے
''لبیک اللھم لبیک''
کہتے گھوم رہے ہوں/ اللہ کے گھر کے اُور
ویسے ہی ہر ک کامڑا/ بول رہا
''بول بم''، ''بول بم''
مگر اس کو گیان نہیں ہے
کہنا کیا ہے کرتا کیا ہے/ ہم تم بابا دھام کو ساجن
یا پھر گیتا دھام ہی کیوں نا
کب جائیں گے
جل چڑھا کے کب پائیں گے
منو کا منا اپنی؟

(۶) بھادوں

اشلیکھا اور زمگھا پچھتر/ حدِ نظر تک
پانی کی روپہلی چادر/ اتنا کچھ پھیلا وہ چکا ہے
کہ بچے کاغذ کی ناؤ بہا کر/ خوش ہوتے ہیں
لیکن ان کو پتہ نہیں ہے
کتنوں کے گھر کی کچی دیواریں
میرے دل کی طرح سے وہ بھی
رس رس کر وہ ڈھ رہی ہیں ـــــ (جاری)

فرزانہ خانم، جمشید پور

تصور

میری کھلی آنکھوں میں بھی
خواب تمہارے ہی ہوتے ہیں
اور جب میں
اپنی دونوں پلکوں کو بند کر لیتی ہوں
تو اُن میں بھی/ تم ہی ہوتے ہو
تمہارا تصور میری نس نس میں
ایک تھرتھری پیدا کرتا ہے
تمہارے پاس ہونے کا احساس
میری سانسوں کو مُرتعش کرتا ہے
اور تب یہ گمان ہوتا ہے
دنیا میں جادو ہے
اور وہ جادو/ تم ہو ـــــ ☆

علیم اللہ حالی، گیا

موسم نہیں بدلا ہے

وہی آب وگل پیکر نو بہ نو میں
وہی رنگ و بوغنچۂ نورسیدہ سے اب تک ہویدا
وہی حرف وصوت وصدا شعر ونغمہ میں جلوہ فگن
وہی سازِ دل اور مضرابِ احساس کی سحرانگیزیاں ہیں
وہی شام کا اضطراب اور شب کی اداسی
وہی ڈوبتی رات میں دھیرے دھیرے قریب
آنے والی صدا
وہی کوئی سایہ سادہلیز احساس پر رقص فرما
وہی میں، وہی تم
ہراک شئے اسی طرح تازہ ہے بزمِ خیالات میں
کوئی نور سا جگمگاتا ہے ظلمات میں
کہ زندہ ہے ساری حقیقت طلسمات میں — ☆

سلیم انصاری، جبل پور

کس سے پوچھوں

کس سے پوچھوں
جب بھی کوئی نظم مکمل ہوجاتی ہے/ میرے اندر
ایک خلا کیوں بھر جاتا ہے؟/ کیوں مجھ کو ایسا لگتا ہے
جیسے میرے خواب کسی نے چھین لئے ہیں
زخموں کے مہتاب کسی نے چھین لئے ہیں
کس سے پوچھوں/نظم مکمل ہوتے ہی کیوں
بے چہرہ یادوں کے پنچھی/ درد کے موسم
میرے بدن سے کیوں ہجرت کرنے لگتے ہیں
میرے اندر/ تنہائی کا خوف اترنے لگتا ہے کیوں
کس سے پوچھوں/ لمحے بھر کی تخلیقی لذت کی خاطر
میں صدیوں کے غم سے
اپنی محرومی پر کیوں راضی ہوجاتا ہوں — ☆

احمد سہیل، امریکہ

دل کا معاملہ

ہم بے حساب محبت کرتے ہیں
کسی کو اس قدر چاہے جانا
دیوانگی کا واہمہ ہے
پھول نگر کے کھوئے ہوئے لوگوں کی تلاش
شہر میں ہنگامہ خریدتے ہوئے لوگوں کے افلاس
ہم کسی کو نہ چاہتے ہوئے بھی
کسی سے منسوب ہوجاتے ہیں
صدیوں کی لمبی جدائی
وہ سلگتے دل پر مسکراتے گذر جاتی ہے
دل کا معاملہ اندھیرے میں مشکوک ہوجاتا ہے
کہر آلود دل میں یہ کون دھڑ کتا ہے
پتھر کے آدمی کی طرح گم سم/ جو اگنی سنا بھی نہ سکے
جو دل کا سانحہ بتا بھی نہ سکے/ پیتل کے ناخن والا ظالم
وہ لوہے کے ہاتھوں والا قاتل
رات کے کسی سہانے پہر/ تیری یاد کی لگن
مجھے لمحہ بھر کیلئے بیدار کردیتی ہے
کیا دریادگار کے حافظے پر/ اب بھی میرا نام کندہ ہے
تو ہی بتا/ کب تک تیرے عشق پر ناز کروں
کب تک تیری یادمیں دربدر پھروں — ☆

ظہیر غازی پوری، ہزاری باغ

رباعیات

(۱)

وحشت کا عجب رنگ دکھا دیتی ہے
تا حدِ نظر خون بہا دیتی ہے
تہذیب اگر ناچتی ہے ننگا ناچ
سیندور بھی مانگوں کا جلا دیتی ہے

(۲)

ولیوں کی، رسولوں کی، پیمبر کی زمیں
ہے جبر و ہلاکت کی، ستم گر کی زمیں
زینے سے وہ اترے تو یہ منظر دیکھے
ہے خون میں ڈوبی ہوئی ہر گھر کی زمیں

خالد عبادی، نئی دہلی

(۱)

کہنے سے کسی کے نہیں قائل ہوتا
دل عرضِ ہنر پہ نہیں مائل ہوتا
افسوس بھی کرنے سے بھلا کیا حاصل
اے کاش کہ شاعر نہیں مسائل ہوتا

(۲)

اک مصرع شجاع کا ہے تو اک بانی کا
اک مصرع یگانے کا تو اک فانی کا
پیہم ہے مرا یا خونئے پانی میں
چہرہ نہ اُتر جائے کہیں پانی کا

ڈاکٹر فراز حامدی، جے پور

اُردو دوہے

سورج کل کب آئے گا اس کا نہیں ملال
ہم نے خوش ہو کر کیا شب کا استقبال
جتنا میں خوشحال ہوں اُتنا ہی بے زار
جینا اپنے آپ میں کتنا ہے دُشوار
بس میں ہی زَد پر رہوں یہ بھی کوئی بات؟
دُنیا مجھ پر تجربے کرتی ہے دن رات
چہرہ ہر انسان کا کتنے روپ دکھائے
دریا میں اِک اور بھی دریا بہتا جائے
دن کا سارا غم کریں روز خوشی کے نام
اپنے اپنے جام کو ٹکرائیں ہر شام
مجبوری اک وہم ہے مت لے اس کی آڑ
رفتہ رفتہ کھیت کو کھا جاتی ہے باڑ

رازؔ سیوانی

رشتہ

تیرا میرا رشتہ کیا ہے
میں تو تیرا کوئی نہیں ہوں
تیری یادوں سے لیکن / درد کا رشتہ ابھرا ہے
لیکن، تیری یاد سے کب تک
اپنا دل بہلاؤں گا
اک نہ اک دن ایسا ہوگا / درد کا رشتہ ٹوٹے گا
تجھ کو ملے گا کیف کا ساغر
تنہائی کا زہر مجھے ——☆

غزلیں

منظر شہاب، جمشید پور

(نذرِ گجرات)

کیا ضروری ہے فسادات لکھیں
کیوں نہ اس لفظ کو گجرات لکھیں

شرط قاتل کی ہے جینا ہو تو ہم
ظلم کو لطف و عنایات لکھیں

آگ کو دھوپ کہیں، گیس کو ابر
موسمِ قتل کو برسات کہیں

جلتے شہروں کو، حقیقت سے بعید
اگلے وقتوں کی حکایات لکھیں

اپنے ہاتھوں میں کٹے اپنے ہی سر کو
یادِ دلدار کی سوغات لکھیں

حکم ہے، اس کے ستم کو ہم بھی
باعث فخر و مباہات لکھیں

بُت کافر کا تقاضہ ہے شہابؔ
مسجدوں کو بھی خرابات لکھیں

پرکاش فکری، رانچی

کیسی ہے یہ امیری جس سے نکل نہ پائے
خوابوں کی رہ گذر پر دوگام چل نہ پائے

یہ جو نظارگی ہے تصویر میں نہ اُترے
اندر جو بے کلی ہے لفظوں میں ڈھل نہ پائے

یوں تو لباس کہنہ ہم نے اتار پھینکا
پھر آئینہ بھی بدلا خود کو بدل نہ پائے

چاروں طرف ہوا کی اک موج بے عناں ہے
کوئی چراغ ہم سے ایسے میں جل نہ پائے

شاخیں بھی ایسی نازک پھولوں سے جھک گئی ہیں
یہ رنگ یہ پھبن بھی اُن سے سنبھل نہ پائے

بے زاریاں جسے میں بیگانہ وش جہاں سے
وہ دل کسی بھی صورت فکریؔ بہل نہ پائے

ڈاکٹر مسلم شہزاد، نرکٹیاگنج (مغربی چمپارن)

اب کون دوانوں کی طرح آئے گا صاحب
آ کر مری بانہوں میں سما جائے گا صاحب

ہر آن بدلتا ہوا موسم سا مرا عہد
سایہ سا کبھی سامنے لہرائے گا صاحب

تھک ہار کے بیٹھا تو کھلا مجھ پر یہ عقدہ
یہ راستہ ہر موڑ پہ بل کھائے گا صاحب

اپنی تو چکا چوندھ اُجالے میں کٹی ہے
ماحول اندھیرے کا کہاں بھائے گا صاحب

ابھرا ہے اُفق سے جو بھی مطلعِ گُل رنگ
بس چشم زدن میں وہ ستم ڈھائے گا صاحب

بے چہرگی کی دُھند میں نکلے بھی تو شہزادؔ
کھوئی ہوئی پہچان کہاں پائے گا صاحب

نسیم سحر، جدہ (سعودی عربیہ)

جو مجھ میں رہتا ہے سادھو، مجھے تلاش کرے
لگا کے نعرۂ یاہُو مجھے تلاش کرے
مجھے یہ لگتا ہے جیسے مَیں اب کہیں بھی نہیں
مُرا وجود بھی ہرسُو مجھے تلاش کرے
ہنسی نہیں تھی اُسی کی مِرے مقدر میں
وہ جس کی آنکھ کا آنسو مجھے تلاش کرے
مَیں چوبِ خشک ہوں، صحرا مِرا ٹھکانہ ہے
سو اب کوئی نہ لبِ جُو مجھے تلاش کرے
سفر نصیب ہمیشہ رہوں ہَوا کی طرح
چمن چمن کوئی خوشبو مجھے تلاش کرے
حِصار کھینچ کے روپوش اُس میں ہوجاؤں
جب اُس کی آنکھ کا جادُو مجھے تلاش کرے
یہ چاہتا بھی ہوں اب تو نہ پاسکے مجھ کو
مگر یہ شوق بھی ہے تُو مجھے تلاش کرے!
نسیم دھوپ میں جل جاؤں، راکھ ہوجاؤں
پھر اس کا سایۂ گیسو مجھے تلاش کرے

سلطانہ مہر، برمنگھم

ہم قفس میں رہ کے جس کو آشیاں کہتے رہے
تھی فقط حدِ نظر ہم آسماں کہتے رہے
اک سرابِ مستقل کو گلستاں کہتے رہے
اس بتِ نامہرباں کو مہرباں کہتے رہے
آندھیوں نے آشیانہ تو مٹاڈالا مگر
چند تنکے آشیاں کی داستاں کہتے رہے
جب زباں نے ساتھ چھوڑا بن گئیں یہ ترجماں
ہم جن آنکھوں کو ہمیشہ "بے زباں" کہتے رہے
کارواں نظروں سے اوجھل تھا اور اوجھل ہی رہا
ہم غبارِ کارواں کو کارواں کہتے رہے
دل کے اک چھوٹے سے گوشے میں وہ جاکر گم ہوا
جس کو نادانی میں ہم سارا جہاں کہتے رہے
اس عقیدت کا بُرا ہو ہم بیاباں کو بھی مہر
خونِ دل سے سینچتے اور گلستاں کہتے رہے

شبینہ نوشاد، کوارٹر نمبر ۳، ایل پی، دربھنگہ

تاریک سے لمحوں میں اک شمع جلی پھر سے
کانٹوں بھری راہوں کو مشکل سے سجایا تھا
دیکھوں تو کدھر دیکھوں، جاؤں تو کہاں جاؤں
کیوں دور ہوئے مجھ سے دو بول محبت کے
ویران سی آنکھوں میں خاموش تھے آنسو بھی
میں راہ تکوں کس کی، ہے کون مسیحا جو
جینے کو شبینہ پھر اک راگ نیا چھیڑو

غم کھائے کلیجے پر اک چوٹ لگی پھر سے
دامن میں چلی آئی اک روتی کلی پھر سے
ہے کون جو پی جائے آنکھوں کی نمی پھر سے
کیوں چھین لی دنیا نے ہونٹوں کی ہنسی پھر سے
جذبات کی آندھی میں ہلچل سی مچی پھر سے
راہوں میں بچھادے وہ پہلی سی خوشی پھر سے
گم ہوش ہوئے میرے، لو سانس رُکی پھر سے

کرشن کمار طور

طفیلی صاحب ادراک رکھنے پر خوش ہیں
زمیں کو یہ مرے افلاک رکھنے پر خوش ہیں

خبر ہے سب کو کہ وہ شخص ان کا دشمن ہے
مگر یہ لوگ اسے چالاک رکھنے پر خوش ہیں

ہمارے واسطے لعل و گہر ہیں بے وقعت
ہم اپنی گدڑی میں خاشاک رکھنے پر خوش ہیں

اگر چہ اشک چھڑکتے ہیں اپنے زخموں پر
مگر زمانے کو سفاک رکھنے پر خوش ہیں

ہم اہل دل کو برا بھی کہیں تو کیسے کہیں
یہ لوگ خاک ہیں اور خاک رکھنے پر خوش ہیں

وہ سرفراز ہمیں کر رہے ہیں عشق سے طورؔ
زمیں زدوں کو الم ناک رکھنے پر خوش ہیں

پروفیسر حفیظ بنارسی

نہ بتوں کے آگے جھکو کبھی نہ طواف بیتِ صنم کرو
بڑا محترم ہے تمہارا سر نہ ہر اک جگہ اسے خم کرو

تمہیں اقتدار ملا ہے جو تو سبھی پہ لطف و کرم کرو
نہ یہ ظلم ڈھاؤ کسی پہ بھی نہ یہ کاروبارِ ستم کرو

وہ حیات کوئی حیات ہے فقط اپنے غم میں بسر ہو جو
کبھی دوسروں کا خیال بھی کبھی دوسروں کا بھی غم کرو

ہے یہی تقاضۂ زندگی کہ رہے کہیں نہ کوئی کمی
کرو دشمنوں سے بھی دوستی ہیں جو دوریاں انہیں کم کرو

نہ بنو حلیفِ ستم گراں نہ لکھو قصیدۂ قاتلاں
جو عطا ہوا ہے قلم تمہیں تو کچھ احترام قلم کرو

نہ تو کچھ یہاں نہ تو کچھ وہاں ہے تمہارے دل میں ہر اک جہاں
نہ طلب کرو کوئی آئینہ نہ تلاش ساغرِ جم کرو

یہی شاعری ہے حفیظؔ جی ہے یہی کمال سخن وری
جو کہی گئی نہ سنی گئی وہی داستان رقم کرو

عبدالحق امامؔ، گورکھپور

ٹوٹ چکا ہے دل کا درپن
کون کرے اب گھر کا درشن
شاخوں پر لٹکے ہیں چہرے
ان کی فکر نہ ان کی یادیں
تحریکوں کا روپ نہ دھارے
دو اک ہوں تو زخم دکھاؤ
سنگ دلوں کا دیکھ کے تیور
اہل ادب سے کہہ دو امامؔ اب

کس کو کہیں اب اپنا دشمن
آپسی ہے آنگن آنگن
''پھول کھلے ہیں گلشن گلشن''
آج تہی ہے اپنا دامن
جنتا کی یہ بڑھتی الجھن
آج ہے چھلنی اپنا سب تن
ہوگیا اپنا دل بھی آہن
نازشِ فن ہے میرا بھی فن

محمد سالم، امریکہ

(سید منظر امام کے لئے)

فنا کے راستے پر گامزن ہیں ہم مرے ہمدم
سنبھل کر پاؤں رکھیں اب، ہے شامِ غم مرے ہمدم

اندھیرے میں نکلنا ہے تلاش نور میں تجھ کو
کبھی تو ہو نہ تیرے درد کی مدھم مرے ہمدم

گذرتی جارہی ہے عمر ساری فکر دنیا میں
کبھی ہو فکر فردا میں نگہہ پُرنم مرے ہمدم

ریا کی حکمرانی ہر طرف ہے تو بھی اب دکھلا
یہاں اخلاص کی شمشیر کا دم خم مرے ہمدم

چراغ علم و فن تیرا اگر روشن رہے یونہی
نہ ہوگا جلوۂ فکر و نظر بھی کم مرے ہمدم

ہوا باطل کی اب پھر سنسناتی ہے زمانے میں
ہراساں کیوں ہے تو رکھ کر ''یقیں محکم'' مرے ہمدم

تیری یادوں کا پرچم جب بھی لہراتا ہے آنکھوں میں
تری قربت بھلادیتی ہے حالِ غم مرے ہمدم

ظفر اقبال ظفرؔ، فتح پور (یوپی)

ہر لمحہ اک سراب مسلسل ہے دیکھنا
پتھر کے راستے میں بھی دلدل ہے دیکھنا

اپنے بدن کو اس کے حوالے ہے کردیا
اب تو حریف کا مجھے کس بل ہے دیکھنا

کرتا ہوں اُس سے چھیڑ ہوا کی مثال میں
زلفیں بکھیر کر مجھے بادل ہے دیکھنا

خود کو جلاتا رہتا ہوں اُس کی تپش سے میں
سورج کی آنکھ میں مجھے کاجل ہے دیکھنا

بستی کی سمت رُخ ہے بچے گا نہ کوئی گھر
اب تو ہوائے دشت بھی پاگل ہے دیکھنا

اب کیسے زندگی کا سفر طے کروں ظفرؔ
چاروں طرف عجیب سا جل تھل ہے دیکھنا

حیدر قریشی، جرمنی

خود اپنے واسطے آزارِ جاں ہونے لگا ہوں
کسی نامہرباں پر مہرباں ہونے لگا ہوں
غزل کے رُوپ میں جو قصہ خواں ہونے لگا ہوں
تو یوں لگتا ہے تیری داستاں ہونے لگا ہوں
کچھ عرصہ خوش گمانی بھی رہی ہے اس سے بے شک
مگر اس شوخ سے اب بدگماں ہونے لگا ہوں
مجھے معلوم ہے سلطان جابر کیا کرے گا
مگر میں کلمۂ حق ہوں، بیاں ہونے لگا ہوں
کسی کی ناروا پابندیوں کو توڑ کر اب
دلوں میں گونجنے والی اذاں ہونے لگا ہوں
گھٹن کب دیر تک رستہ ہوا کا روک پائی
اُسے کہہ دو کہ میں پھر سے رواں ہونے لگا ہوں
مجھے دھرتی پہ ہی رہنا تھا ہر حالت میں حیدرؔ
مگر یہ کیا ہوا کہ آسماں ہونے لگا ہوں

سیدہ نسرین نقاش، سری نگر

اپنے جلوؤں کے حسیں پھول کھلاتے چہرے
کاش ہم کو بھی کلیجے سے لگاتے چہرے
عمر بھر ساتھ رہے پھر بھی یہ ارمان رہا
ہم سے کچھ اپنا تعارف بھی کراتے چہرے
اس طرح گونجتی ہے دشت وفا میں وحشت
بارہا آپ کے نزدیک ہی لاتے چہرے
بحرِ غم سامنے ہے دور کنارا بھی ہے
ناؤ اس حال میں کیا پار لگاتے چہرے
تیز آندھی میں تر و تازہ گلابوں جیسے
شاخ سے ٹوٹ گئے ہنستے ہنساتے چہرے
کتنی پُر کیف سی اب وادیٔ کشمیر ہوئی
خوف سے لوگ یہاں پھرتے چھپاتے چہرے
اپنی گفتار میں کیا تیغ و تبر رکھتی ہوں
پھول بھی پاس نظر آتے چھپاتے چہرے
یہ بھی ممکن ہے کہ ہم تیری طلب میں نسرینؔ
ایک چہرے پہ کئی چہرے سجاتے چہرے

نادر اسلوبی، وارنگل

جانتا کم ہے بولتا ہے بہت
میں نئے دور کا پیامی ہوں
ایک حساس آدمی کے لئے
سادہ لوحی نہ بھینٹ چڑھ جائے
ڈر رہا ہوں میں آگ سے نادرؔ

خود فریبی میں مبتلا ہے بہت
مجھ کو لفظوں کا آسرا ہے بہت
ایک چھوٹا سا حادثہ ہے بہت
حُسن خنجر کا دلربا ہے بہت
دل تو جنگل سے آشنا ہے بہت

مجازؔ جے پوری

کسی معصوم پہ آئے ہوئے الزام سی ہے
زندگی آج کسی جرم کا انجام سی ہے
رقص کرتے ہیں اُجالوں پہ گناہوں کے ہجوم
روشنی زلف کے سائے میں بھی بدنام سی ہے
دل کی راہوں سے گذرتی ہے حوادث کی طرح
یاد بھی اب تو تری گردشِ ایام سی ہے
دل کا ارمان، کہ مفلس کی سحر ہو جیسے
آرزو قیدیٔ زنداں کی کسی شام سی ہے
فکر الجھی ہے تصور کے بیابانوں میں
جستجو خواب کے صحرا میں بھی ناکام سی ہے
اس طرف جال دلیلوں کے ادھر زلف کے دام
خوئے واعظ بھی چلو فطرتِ اصنام سی ہے
کچھ تو دشوار ہے منزل پہ پہنچنا ہی مجاز
اور کچھ گردشِ دوراں بھی غلط گام سی ہے

جاوید اختر چودھری، برمنگھم

بڑا شہرہ ہے جس کے علم و دانش کا زمانے میں
اسی کا ہاتھ ہے حالات کو ابتر بنانے میں
میں گھر کے سامنے فٹ پاتھ پر حیران پھرتا ہوں
بہت تاخیر کر دیتے ہیں میرے دوست آنے میں
ذرا سی دیر لگتی ہے تعلق توڑ دینے میں
زمانے بیت جاتے ہیں لگی دل کی سنانے میں
کسی کی سازشوں نے کر دیا گھر کو میرے مسمار
میں خود کو ناتواں پاتا ہوں یہ ملبہ اٹھانے میں
کہانی کے سبھی کردار جب بے جان ہو جائیں
بڑی دشواریاں ہوتی ہیں سننے میں سنانے میں
کوئی گرتی ہوئی دیوار کو کب تک سہارا دے
نہیں کوئی تردد اب مجھے اس کے گرانے میں
میں اپنے ہی قبیلے کی شکایت کر نہیں سکتا
سمجھتا ہوں کہ جو جو لوگ شامل ہیں فسانے میں
مجھے نرغے میں آخر لے لیا ہے کالے ناگوں نے
چھپا بیٹھا تھا مارے خوف کے اپنے ٹھکانے میں

فرزانہ نیناںؔ، برطانیہ

شام کی سنسناہٹوں میں گم
دل کسی درد سے بھر آیا ہے
آنکھ لائی تھی قرضِ بینائی
تیری پازیب رقص میں گونجی
انتظاروں بھری کوئی لڑکی
آہ و نالہ کی تیز رَو یورش
ہونٹ سے بات آ کے نیناںؔ میں

ہوں عجب، تلملاہٹوں میں گم
تھا تری مسکراہٹوں میں گم
اب ہے یہ جگمگاہٹوں میں گم
بزم ہے جھنجھناہٹوں میں گم
ایک لڑکے کی آہٹوں میں گم
جسم ہے تھرتھراہٹوں میں گم
کیوں ہوئی ہچکچاہٹوں میں گم

حصیر نوری، کراچی

شجر ہوں دشت کا میں سر پہ دھوپ سہتا ہوں
مسافروں کو مگر نرم چھاؤں دیتا ہوں

چلو یہ دشمنی چھوڑو گلے سے لگ جاؤ
میں تم سے اپنا تعلق بحال کرتا ہوں

میں جانتا ہوں دکھی ہو، مری طرح تم بھی
تمہاری شوخ بیانی سے پھر بھی ڈرتا ہوں

دھرے گا کون مرے سر پہ ہاتھ شفقت کا
کہانی پڑھ کے تمہاری میں کتنا رویا ہوں

نہ غمگسار ہے میرا نہ مہرباں ہے کوئی
مگر میں سب کے لئے دل میں درد رکھتا ہوں

حیات بخش اصولوں کی روشنی ہے یہی
شکستہ دل ہوں مگر دوستوں میں ہنستا ہوں

سبب کھلا نہ کسی پر کبھی بھی اس کا حصیرؔ
میں اپنی راہ میں کانٹے بچھا کے چلتا ہوں

صابر عظیم آبادی، کراچی

حُسن کے باب سے باہر نکلو
قصرِ شاداب سے باہر نکلو

دیکھنی ہے جو بہارِ قدرت
وادیٔ خواب سے باہر نکلو

ڈوب جاؤ نہ کہیں آنکھوں میں
پیچ و گرداب سے باہر نکلو

عیش و عشرت کی تمنا ہے اگر
غم کے محراب سے باہر نکلو

تم سے کہتی ہے مری تنہائی
بزمِ احباب سے باہر نکلو

آنسوؤ! اتنا پریشاں کیوں ہو
چشمِ بے تاب سے باہر نکلو

سازِ ہستی کو صدا تم دے کر
ضربِ مضراب سے باہر نکلو

خودکشی پر ہو تلے کیوں صابرؔ
نکلو تالاب سے باہر نکلو

آشا شیلی، ہماچل پردیش

اے ہوا اترا نہ اتنا تو بڑی نادان ہے
آندھیوں میں بھی جلیں گے جن دیوں میں جان ہے

گونجتی ہے کوہساروں میں فقط تیری صدا
ہم نوا کوئی نہیں تو کس لئے حیران ہے

کل تلک منھ میں نہیں تھی جس پرندے کی زباں
آج اُس کے حوصلوں پر ہر کوئی حیران ہے

دُور سے اُڑ کر بدلتی رُت میں جو آتے رہے
اُن پرندوں کی بدولت وقت کی پہچان ہے

لوگ کہتے ہیں دیا وہ بجھ گیا لیکن نہیں
یہ غزل پارہ میرے رہبر کا ہی احسان ہے

ڈاکٹر شباب للت، شملہ

سودائی دیوانی رات
کرتی ہے من مانی رات
دن پل پل سنجیدہ سا
سرتاپا شیطانی رات
تجھ بن آگ لگاتی ہے
شملے کی برفانی رات
کیسے کیسے جذبوں کی
دی ہم نے قربانی رات
لاکھ بچائے اس کے وار
پھر بھی ہار نہ مانی رات
کیوں شرمندہ ہو اُس پر
ہوگئی جو نادانی رات
اک پیاسے پر دیسی کو
دے گی پریم نشانی رات
مفلس کی کٹیا میں ہے
اندھا دن اور کانی رات
خواب ہوئی وہ عمر شباب
جو تھی اِک طوفانی رات

رئیس الدین رئیس، علی گڑھ

سبھی ہیں چپ کوئی اہل نو نہیں ہے یہاں
کسی کے ہاتھ میں تیغ انا نہیں ہے یہاں
جو کیجے غور تو ہونے کو کیا نہیں ہے یہاں
محبتوں کی کمی ہے وفا نہیں ہے یہاں
یہاں بھی کھلتے کبھی پھول خوشبوئیں اڑتیں
مدام حبس ہے جاری ہوا نہیں ہے یہاں
سبھی کو فکر کہ سرخم آسمان کیوں ہے، مگر
اٹھائے کوئی بھی دستِ دعا نہیں ہے یہاں
یہ کون لوگ ہیں اس عہد خوش لباسی میں
کسی کے جسم پہ اُجلی قبا نہیں ہے یہاں
نہ کوئی طاق سیدھے نہ کوئی دروازہ
مرے خیال سے کوئی رہا نہیں ہے یہاں
رئیس اب تو یقیں کر یہ شہر ہے تیرا
کہ ایک بھی تو ترا آشنا نہیں ہے یہاں

اشرف گل، کیلی فورنیا

جُدائی کے صدمے اٹھا کر جئیں گے
ہمیشہ مگر مسکرا کر جئیں گے
ستاروں کی قسمت تو تھی جاگنا ہی
خبر کیا تھی ہم کو جگا کر جئیں گے
ہم آہوں کو بھی لب پہ آنے نہ دیں گے
غموں کو بھی لوری سنا کر جئیں گے
جھکائیں گے سر جو بھی آگے خُدا کے
جہاں میں وُہی سر اٹھا کر جئیں گے
ستم پر تمہیں ناز ہوگا، مگر ہم
جفا کو وفا سے جھکا کر جئیں گے
شبِ تارِ فرقت کے رخسار پر ہم
چراغِ تمنا جلا کر جئیں گے
یہی رُوپ طوفان کا دھار لیں گے
اگر آنسوؤں کو چھپا کر جئیں گے
ازل سے ہے اُلفت کا دشمن زمانہ
نہ ہم اِس کی باتوں میں آکر جئیں گے
اگر موت آئی تو کچھ دیر اشرفؔ
اُسے شعر و نغمہ سنا کر جئیں گے

ڈاکٹر رضوان الرضا رضوانؔ، علیگڑھ

یا نظر آتا ہوں محو خواب اکثر بیشتر
یا تو پھر رہتا ہوں میں بے خواب اکثر بیشتر

یاد ماضی حال کا غم اور مستقبل کی فکر
ساتھ رہتے ہیں یہی اسباب اکثر بیشتر

صورتیں جن کی نظر میں فاری چبھتی رہیں
ان کو بھی کرنا پڑا آداب اکثر بیشتر

حادثوں نے سب کے چہروں کو بدل کر رکھ دیا
دیکھ کر ہوتا ہے استعجاب اکثر بیشتر

مشغلہ میں بن گیا ہوں ان کی صبح و شام کا
دل دکھانے آتے ہیں احباب اکثر بیشتر

لے گیا ہے چھین کر وہ ہجر کی سب لذتیں
ورنہ سجتے تھے خیال و خواب اکثر بیشتر

بھولنے کی کوششیں ناکام زیادہ تر ہوئیں
یاد نے اس کی کیا بیتاب اکثر بیشتر

عثمانہ اختر جمال، امریکہ

کوئی تو آئے جیون کی نیا پار لگانے کو
دل کی دھڑکن تیز ہوئی کیا پھر دل کے بہلانے کو
تجھ بن میرے دل کو بولو، اور کوئی بھائے بھی کیوں؟
لیکر سارے درد ہمارے دیدے تھوڑی خوشیاں بھی
صبح کبھی عثمانہ کالی رات سے باہر آئے گی

ہم بھی ہیں تیار کسی کی راہ میں اب مٹ جانے کو
درد نرالا ہے یہ کیسا تڑپائے بیگانے کو
گذرے ہیں ہم سخت ڈگر سے ایک تجھے اپنانے کو
غم کو ہی اپنا مانا تھا دل کی بات نبھانے کو
سورج کی کرنوں سے اپنی پیشانی چمکانے کو

ڈاکٹر افضال فردوس پادری، امریکہ

شوقِ سفر میں یوں بھی نہ مرجانا چاہئے
بارش بھی ہے ہوا بھی ٹھہر جانا چاہئے

آنے کو ہے پہاڑ پہ طوفان برف کا
محفوظ وادیوں میں اتر جاتا چاہئے

یہ اور بات ہے کہ کوئی منتظر نہ ہو
ہاں شام ہوگئی ہے تو گھر جانا چاہئے

ممکن ہے لوٹ کر نہ کبھی آسکیں اِدھر
پھر بھی چراغ راہ میں دھر جانا چاہئے

اب تو لہو کا آخری قطرہ بھی جل چکا
اب تو سحر کا رنگ نکھر جانا چاہئے

سعید روشن، کویت

طوفان کا ساحل پہ اثر بول رہا ہے
ٹوٹی ہوئی کشتی میں بھنور بول رہا ہے
گم گشتہ مکینوں کی خبر بول رہا ہے
بستی سے بہت دور کھنڈر بول رہا ہے
خوشیوں سے بھرا آج جو گھر بول رہا ہے
لکنت سے مرا لختِ جگر بول رہا ہے
روتی رہی ہے رات یہاں بیٹھ کے بہت
سبزے پہ پڑا ایک گہر بول رہا ہے
سویا ہے بڑی دیر گھنی چھاؤں کے نیچے
خاموش مسافر ہے سفر بول رہا ہے
کھلتی ہی نہیں ہم پہ تو سانسوں کی حقیقت
یہ جسم ہے کہ بارِ دیگر بول رہا ہے
سائے سے لرز جاتا ہوں میں اپنے ہی روشنؔ
پوشیدہ مرے دل میں جو ڈر بول رہا ہے

احمد فرمان، مدیر ''شہپر''، دھنباد

نغمگی اظہار پیدا کیجئے
عنبریں کردار پیدا کیجئے
ہو بھروسہ جس پہ سب کا دوستو
ایسا اِک سردار پیدا کیجئے
جب شرافت حد سے بڑھ جائے تو پھر
تھوڑا سا پندار پیدا کیجئے
زندگی کو پیار کی خوشبو ملے
ایسا اِک سنسار پیدا کیجئے
فکر وفن کے ساتھ ہی فرمانؔ آپ
ذہن بھی بیدار پیدا کیجئے

گلشن کھنہ، یو۔کے

بغض و حسد کی آگ میں انسان جل گئے
بجلی گری کچھ ایسی کہ کھلیاں جل گئے
نفرت میں آتما کی نفی اس طرح نہ کر
کیا پھول بچ سکیں گے جو گلدان جل گئے؟
جلنا تو دھوپ میں تھا مقدر پہ، غم یہ ہے
ہر تیرے آستاں پہ مری جان جل گئے
کھیتوں میں میرے دیکھ کے گندم کی بالیاں
''اپنے لہو کی آگ میں دہقان جل گئے''
اتنے ستم ہوئے ہیں وفاؤں کے نام پر
جتنے تھے میرے دل میں وہ ارمان جل گئے
افسوس زندگی میں یقیں ہے نہ خوش دلی
اس دور میں یقیں کے فرمان جل گئے
گلشن ہمارے باغ میں کیسی لگی یہ آگ
گلہائے غم کے ساتھ دل و جان جل گئے

شاہین، کینیڈا

کیا کیا رہی نہ گرمیِ بازار شب بخیر
دن آج بھی گزر ہی گیا یار شب بخیر
چاہت سمیت چھوت کے ہیں روگ اور بھی
پر ہم نہ اب بنیں گے خریدار شب بخیر
جو وسوسے تھے ہم نے سپردِ جہاں کئے
یہ جُرم ہے تو ہم کو ہے اقرار شب بخیر
اچھا ہوا مرض کا پتہ دیر سے چلا
مر جاتا ورنہ پہلے ہی بیمار شب بخیر
منہ میں لہو کا ذائقہ جس فصلِ گل کا ہے
کل بھی رہے گا اس سے سروکار شب بخیر
باتوں میں ہم گھروں سے نکل آئے کتنی دور
اب صبح ہو چلی ہے مرے یار شب بخیر
شاہیؔن ورنہ نیند ہی اُڑ جائے گی تری
مت دیکھ ہیں یہ زخم کہ اشعار شب بخیر

ڈاکٹر منصوؔر عمر، دربھنگہ

گروی ہر ایک شخص نے ایمان رکھ دیا
ہم نے اٹھا کے طاق پر قرآن رکھ دیا
اوراقِ کرم خوردہ کو دریا میں ڈال کر
لے جا کے گھر بوسیدہ سا جزدان رکھ دیا
دنیائے سیم و زر کو جس نے حیثیت نہ دی
قدموں میں اس کے لُولُو و مرجان رکھ دیا
کشتی نکال لائے بھنور سے تو کیا ہوا
ساحل پہ ہم نے تازہ اک طوفان رکھ دیا
خلد بریں سے دُور بسایا تھا اک جہاں
تونے یہاں بھی لشکرِ شیطان رکھ دیا
عقل و خرد سے تونے نوازا جو بے پناہ
تیری زمیں پہ قہر کا سامان رکھ دیا
منصوؔر اس نے دار پر ہم کو چڑھایا کیا
گویا ہمارے سر پہ اک احسان رکھ دیا

اسحاق ملکؔ، حیدرآباد

نیکیاں بانٹنا ہی بہتر ہے
گر بُرائی مرا مقدر ہے

ٹھن گئی ہے لڑائی آپس میں
اب جو جیتا وہی سکندر ہے

گر خلایق کا جائزہ لیجے
آدمی کا مقام برتر ہے

چہرہ پڑھنے کی کیجئے کوشش
کیا بتائیں جو دل کے اندر ہے

ناسمجھ ہے وہ آدمی کیسا؟
کھوپڑی کا دماغ سر پر ہے

ایک دن وہ ادھر سے ادھر گزرا تھا
راہِ دل آج تک منور ہے

اے ملکؔ ساتھ دورِ حاضر کے
یادِ عہدِ کُہن برابر ہے

تاج پیامی، آرہ

روشنی کا کہیں دیا بھی نہیں
رونما ہوگا معجزہ بھی نہیں

بول کر سچ جو شرمسار کرے
اب کوئی ایسا آئینہ بھی نہیں

درد تو پہلے بانٹ لیتے تھے
اب کوئی درد آشنا بھی نہیں

وقت کا بھی مکاں ہے، کیسے کہوں
وہ کبھی اور کہیں رُکا بھی نہیں

زندگی کیا ہے؟ کیا بتاؤں تاجؔ
میں ابھی اس کو جانتا بھی نہیں

محمد صدیق نقوی، اڈونی

مرے وجود پہ اس طرح سائبان ہے تو
میں اک زمین ہوں اور میرا آسماں ہے تو

بہت دنوں سے یہ حسرت ہے تجھ سے آن ملوں
مکاں میں قید ہوں میں جزو لامکاں ہے تو

تمام راستے تیرے وجود میں گم ہیں
کہ منزلوں کا مری مرکزی نشان ہے تو

میں اپنی ذات کو کیسے بلند و بالا کہوں
میں پستیوں کا مکیں، رفعتوں کی شان ہے تو

ہیں سارے لفظ تری بارگاہ میں عاجز
کسی زبان سے ادا ہو، نہ وہ بیان ہے تو

نظر اپنی اپنی

(تبصرے کے لئے دو کتاوں کا آنا ضروری ہے)

نام کتاب: رضا نقوی۔ آئینہ در آئینہ، مرتب: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، صفحات: ۴۶۹، اشاعت: ۲۰۰۳ء

قیمت: ۲۰۰ روپئے، پتہ: احتساب پبلی کیشنز، بوکارو اسٹیل سٹی، بوکارو، مبصر: حسن امام درؔد، دربھنگہ

جناب رضا نقوی واہی پر کوئی مبسوط اور تفصیلی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ حالاں کہ متعدد جریدوں نے واہی صاحب پر مخصوص شمارے شائع کئے ہیں۔ اُن پرچوں کے بھی اہم مشمولات کو اس کتاب میں شامل کرلیا گیا ہے۔ دیکھا جائے تو ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے ورق ورق زندگی کے تحت ''واہی نامہ'' لکھ کر واہی صاحب کی حیات اور اُن کے ادبی کارناموں کو چھ سات صفحات میں سمیٹ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس پر کچھ مزید اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کا یہ کارنامہ قابل داد ہے۔ وہ اس کے پہلے بھی کئی تالیف و ترتیب پیش کر چکے ہیں یہ کتابیں نہ صرف تحقیق و تنقید کا حق ادا کرتی ہیں بلکہ اُن کی دستاویزی حیثیت بھی ہوتی ہے۔ ان کی مرتب کردہ کتاب ''منظر نامہ''، ''غیاث احمد گدی۔ فرد اور فنکار'' میری نظر سے گذری ہے اور زیر نظر کتاب ''رضا نقوی واہی۔ آئینہ در آئینہ'' میرے دعوی ''دستاویزی حیثیت'' کی تصدیق کرتی ہیں۔ ہندی کے عظیم دانشور، نقاد اور کہانی کار شری لعل شکل کہتے ہیں کہ ہندوستان کے حالات کے تناظر میں تخلیق کی پہلی شرط۔ اس کے سماجی دھارا سے تعلق کو مانتا ہوں اور یہی ہندی کے بیشتر ادیبوں اور نقادوں کا رویہ ہے۔ ہمارے اُردو کے نقاد اب اس طرف پلٹ رہے ہیں۔ ورنہ اپنے مشرقی سرمایہ ادب کو نظر انداز کر کے، یورپ اور امریکہ (خاص طور پر ہاورڈ یونیورسٹی) کے دانشوروں کے نظریوں کی تشہیر میں مصروف رہے۔

رضا نقوی واہی نے علم وفن کو سمجھنے کے لئے صرف ادراک سے ہی کام نہیں لیا بلکہ اُن کے باطن میں ڈوب کر اس کا عرفان حاصل کیا ہے۔ اسی لئے اُن کی نگاہوں میں مغربی تنقیدی نظرئے بے حقیقت رہے اور اپنا ایک الگ اسلوب متعین کیا۔ جس کے پیچھے مشرقی روایات کا گرانقدر سرمایہ تھا۔ اس لئے ان کی سنجیدہ ابتدائی دور کی شاعری ہو یا درمیانی دور کی شاعری ہو یا آخری دور کی شاعری، سب میں قادر الکلامی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی نثر کا بھی الگ الگ اعلیٰ معیار رہا ہے۔ واہی صاحب ۱۹۲۸ء سے شاعری کر رہے ہیں۔ لیکن اُن کی ظریفانہ شاعری کی شروعات، سہیل عظیم آبادی کے اخبار ''ساتھی'' میں ۱۹۵۰ء شائع ہوئی جس کا عنوان ''ایم۔ ایل۔ اے'' تھا اور اس پہلی ہی نظم کی ملک میں دھوم مچ گئی، کیوں کہ اُن کے طنز میں نشتریت ہے ہی، لطافت اور شگفتگی کے

ساتھ مزاح کا حسین عنصر بھی موجود تھا، جو آخر تک قائم رہا۔

یہ کتاب اتنی جامع اور پر معلومات ہے کہ ہمارے اردو ادب (خصوصاً بہار) کی صد سالہ تاریخ نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ دبستان شاد و آزاد سے لے کر آج تک کی ہماری ادبی تحریکوں کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں جو روایت کے دور انحطاط سے لے کر، ترقی پسندی و جدیدیت کی جوانی پھر ان کا بڑھاپا اور فاشزم کی جوانی تک محیط ہے۔

میں ہمایوں اشرف کے اس کارنامے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس کتاب کی دستاویزی حیثیت کے پیش نظر اس کی بھرپور پذیرائی ہونی چاہئے۔

نام کتاب: رُکا ہوا سیل (غزل، رباعی)، شاعر: جمال اویسی، صفحات: ۱۴۴، قیمت: ۶۰ اروپے
اشاعت: ۲۰۰۲ء پتہ: نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی، مبصر: حسن امام درد، دربھنگہ۔

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بھیڑ چال کے نتیجہ میں، ہماری تہذیب اور سماجی و اقتصادی ڈھانچے پر، اس تحریک کے افکار سے جو منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں، جس سے دنیا کے عام انسان لرزہ اندام ہیں۔ لیکن ہمیں اس دور کا ایک شاعر ایسا بھی نظر آتا ہے، جس نے ان تمام نظریات پر گہری نظر ڈال کر اپنی ذہنی کشادگی کو برتتے ہوئے، اس سے صرف وہی اثرات لئے جو ہماری ثقافت کا حصہ ہیں۔ انہوں نے جدید زبان اور اسلوب، نگارش کے ذریعہ نئے استعارات اور تلازمات کا استعمال شعری ضمن کے ساتھ نئے معنوں میں استعمال کر کے اپنی شاعری کو نئے احساسات، نئے فکری اساس بخشے ہیں، جو ایک تازگی کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ ہیں ''رُکا ہوا سیل'' کے شاعر جمال اویسی۔

جمال اویسی کی شاعری پر بہت سارے معتبر نقادوں نے سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر کچھ مزید لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ نہ یہ مختصر تبصرہ اس کا متحمل ہے۔ اس لئے میں کتاب کے مختصر تعارف پر اکتفا کرتا ہوں۔

کتاب کی ابتدا مصنف کے مختصر دیباچہ سے ہوتی ہے۔ جس میں انہوں نے شاعر اور شاعری کے مرتبے کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''شاعر کے لئے ضروری ہے کہ خودی اور خود آگہی کے سرور میں رہے'' اس کے بعد ۱۱۱ غزلیں اور ۳۰ رباعیاں اس کتاب کی زینت ہیں۔ پہلی غزل اس نادر شعر سے شروع ہوتی ہے ۔

تیری خانقاہ میں گم شعور ہوا مرا　　مری دسترس سے خدا ہی دور ہوا مرا

اور پھر میرے چند پسندیدہ اشعار:

اٹھے ہاتھ جب بھی دعاء کے لئے ہمیں ساعت زیست بھاری لگی
زیست کو ہر پل ہمارا امتحاں مقصود تھا دشت سے نکلے تو راہ پرخطر پر آگئے
لوگ بیمار ہوتے جاتے ہیں دہر کا ہر طبیب زندہ ہے
نہ جانے کون سی افتاد اب پڑنے والی ہے دیارِ غیر سے مبہم اشارہ دیکھنا تم بھی
بہت اونچائی پر جا کر تماشہ دیکھتا ہوں الگ ہوتا ہوں دنیا سے تو دنیا دیکھتا ہوں میں
شان سے دیکھئے دنیا زوال آمادہ خمارِ زر سے ہے چہرہ زوال آمادہ

اس کے بعد چراغ سیریز کی غزلیں ہیں، جن کی خوبی یہ ہے کہ چراغ کو کئی معنوں میں بڑی چابکدستی سے استعمال کیا گیا ہے۔

جمال اویسی نے رباعی کی مشکل صنف میں بھی، مختلف مضامین کو بڑی ہی برجستگی اور روانی کے ساتھ باندھا ہے۔اس صنف کو کامیابی سے برتنا۔ایک نوجوان شاعر کے لئے قابل ستائش ہے، کیوں کہ اس میں مشق کی کافی ضرورت ہے۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، اس شعری مجموعہ کی پذیرائی، شعروادب سے دلچسپی رکھنے والوں میں ضرور ہوگی، کیوں کہ یہ شاعری وہ نئی آواز ہے جو دلوں کی گہرائی میں اتر جاتی ہے۔ کتاب کا پروڈکشن، حسین وجمیل ہے۔

نام کتاب: حرف زار، مصنف: عمران عظیم، صفحات: ۱۱۲، قیمت: ۸۰روپے

پتہ: چیمبر ۶۹۴، پٹیالہ ہاؤس کورٹ، نئی دہلی، مبصر: یونس رہبر، سہارنپور (یوپی)

اردو کے ادبی حلقے میں عمران عظیم کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ وہ شعروادب میں اپنی مستحکم شناخت قائم کر چکے ہیں۔ ''حرف زار'' کی صورت میں ان کی تنقیدی صلاحیتیں دیکھ کر یہ کہنے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ تنقید کے منصب کو انہوں نے نہایت ذمہ داری سے نبھایا ہے۔ ''حرف زار'' کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف تخلیق ہی کو اپنے ادبی سفر میں جگہ نہیں دی بلکہ تنقید کو بھی اپنے ادبی سفر کا کامیاب حصہ بنایا ہے۔تنقید کے میدان میں ان کا مستقبل روشن وتابناک نظر آتا ہے۔

زیرنظر مضامین کے مجموعے کو تین ابواب پر مشتمل کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون دلی کا ادبی اور تہذیبی پس منظر ہے۔اس میں مصنف نے دہلی کے ادب وثقافت پر سیر حاصل و پرمغز گفتگو کی ہے۔جس میں اردو زبان کی تشکیل اور فروغ وارتقاء کی نشاندہی نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ کی ہے۔ دوسرا مضمون ''دہلی اور ترقی پسند تحریک'' اور تیسرا مضمون

''ترقی پسند تحریک'' سے متعلق ہیں جس میں تحریک کے آغاز وارتقاء کے تمام پہلوؤں اوررجحانات پر بخوبی روشنی ڈالی ہے کہ ترقی پسند ادبی تحریک کے نہ صرف خدوخال بلکہ اس کا مکمل میدانِ عمل اور نظریاتی منظرنامہ پوری طرح سامنے آگیا ہے۔

چوتھا اور پانچواں مضمون سرسید احمد خاں اوران کے دست راست وقارالملک کے حوالے سے دوسوانحی نوعیت کے مضامین ہیں۔ چھٹے اور ساتویں مضمون میں بالترتیب ''اردو غزل کی ابتدا: ایک جائزہ'' اور ''غزل کا سفر'' میں غزل کے مزاج ومعیار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آٹھویں، نویں مضمون میں ''غالب اور فکر غالب'' اور ''اقبال کا تصور خودی'' خاصے کی چیزیں ہیں اور مصنف کی وسعت نظر اور فکر کی بالیدگی کے غماز بھی ہیں۔

دسویں اور گیارہویں مضمون ''اختر انصاری کی انفرادیت'' اور شہپر رسول کی غزل (چند تخلیقی جہات) کے عنوان سے ہیں۔ اختر انصاری کے عروضی وفنی نظریہ کی وضاحت مصنف نے نجی ملاقاتوں اور شخصی تبادلۂ خیالات کی روشنی میں کی ہے۔ شہپر رسول کی غزل کی تفہیم و توضیح اور تخلیقی جہات کا مفصل جائزہ لیا ہے اوران کی معنویت کو پرکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

دوسرے باب میں ہم عصر شعراء پر تبصرے اور جائزے پیش کئے ہیں۔ آخری باب میں فلمی دنیا اور ترقی پسند تحریک کے نامور شاعر کیف بھوپالی کے فنی نظریات اور ترقی پسند تحریک سے ان کی ذہنی وابستگی کو آشکار کیا ہے۔ اس کتاب میں شامل تمام مضامین وتبصرے مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اور مختلف رسائل وجرائد میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کی تنقید کی شعلگی کی کیفیت ادب میں ایک تہلکہ مچادے گی۔

نام کتاب: انوار خط روشن، شاعر: پروفیسر محمد علی اثر، صفحات: ۸۰، قیمت: ۵۰ روپے

پتہ: نشاط پبلشرز ۴/۲۲۶-۴-۲۰ محبوب چوک، حیدرآباد، مبصر: سردار سلیم، حیدرآباد

''انوار خط روشن'' ایک عنوان نہیں بلکہ ایک عارفانہ گتھی ہے۔ جسے کھولتے جایئے تو معانی کی پرت پرت سے تجلیاں نمودار ہوتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ یہ عنوان ہے۔ پروفیسر محمد علی اثر کے تازہ نعتیہ شعری مجموعے کا۔ اس عنوان کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ''انوار خط روشن'' تاریخی نام ہے جس سے مادۂ سال ۲۰۰۲ء برآمد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر شاعری اور تحقیق کی دنیا میں اپنی ایک منفرد اور مضبوط شناخت رکھتے ہیں، اب تک ان کی بے شمار شعری اور نثری تصانیف وتالیفات منصۂ شہود پر آئیں اور سند قبولیت کے شرف سے سرفراز ہوئیں۔ لیکن ہر حساس صاحب ایمان شاعر کی طرح عشق رسول کی چنگاری جوان کے دل میں بھی چکاچوند کررہی تھی۔ ایک دن طور بن گئی اور انہوں

نے بمطابق اعداد اسم محمد ۹۲ اشعار پر مشتمل ایک مسلسل نعت کہی جس کا تاریخی نام ''نعت رسول خدا'' ہے۔ یہ نعت زبان وفن کے اعتبار سے اتنی شستہ، اتنی مرصع اور اتنی نادر ہے کہ اشعار زبان سے پھسل کر سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ اس کا دوسرا سبب نعت کا وہ شاعرانہ اسلوب ہے جس میں عشق صادق کی گدازیت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ سانس لے رہی ہے۔ ''انوار خط روشن'' اس نورانی اور روحانی سلسلے کی اگلی کڑی ہے۔ جس میں مذکورہ نعت بھی شامل ہے، اس کے علاوہ محامد (مختلف الھیات) نعتیہ غزلیں، نعتیہ ماہیے، نعتیہ ثلاثیاں اور نعتیہ قطعات کا انتخاب جمع کیا گیا ہے جو شاعر کی فکر جدت طراز کا نتیجہ ہے تقریباً تمام تخلیقات اپنی اپنی ہیئتوں میں چست اور درست ہیں۔ بیشتر اہل فن منھ کا مزا بدلنے کے لئے یا پھر اپنی مشاقی کا لوہا منوانے کے لئے یا غیر متغزلانہ بلکہ غیر شاعرانہ اصناف میں بھی طبع آزمائی کر لیتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اثر کے یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ان کی نعتیں تصنع سے پاک اور کھردرے پن سے بے نیاز ہیں۔ کیوں کہ اکثر اشعار بول پڑتے ہیں کہ ہم اپنے خالق کی واردات قلبی کے مظہر ہیں۔ الفاظ رسیلے، لہجہ نرم، اور مضمون معنی خیز۔ کتاب کی ابتدا میں حضرت مولانا سید شاہ جمیل الدین شرفی نے مفکر جمیل کے عنوان سے نعت شریف کے ان گنت پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے بڑے دلچسپ پیرایۂ بیان میں کلام کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے۔ حضرت علامہ شارق جمال نے بھی اختصار اور جامعیت کے ساتھ ڈاکٹر اثر کی فنی صلاحیتوں پر داد تحسین دی ہے۔ اس مجموعے میں شامل بعض نعتوں کے اشعار اتنے صاف ستھرے اور خوبصورت ہیں کہ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ اشعار:

سبز گنبد ہے مرے پیش نظر	ٹوٹنے پائے نہ اب یہ سلسلہ
آفاق کی ہیں شرح تو انفس کی روشنی	لمحے جو آپؐ کے ہیں حرا سے جڑے ہوئے
میں ہوں ٹوٹا ہوا سلسلہ یا نبیؐ	رابطہ، رابطہ رابطہ یا نبیؐ
دل کے آنگن میں روشنی اتری	نام جب بھی لیا محمدؐ کا
پھرتے ہیں منھ چھپائے اندھیرے ادھر ادھر	ماہ تمام جب سے مدینے میں آگیا

ماہیے: وہ شافع محشر ہیں/ پاک نبیؐ میرے/ بخشش کا سمندر ہیں

یہ مجموعہ گو صرف ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے مگر اپنے آپ میں ایک مکمل کائنات عشق ہے، سرورق جاذب نظر ہے۔ کتابت اور طباعت بھی مناسب ہے۔ آخر میں 'نعت رسول خدا' پر مشاہیر ادب کی مختصر آرا شامل کی گئی ہیں۔ جن کے وسیلے سے قاری کو شاعر تک پہنچنے میں کافی مدد مل سکتی ہے کتاب کا خوبصورت عنوان ڈاکٹر فاروق شکیل کی خامہ افروزی کا نتیجہ ہے۔

نام کتاب: سخن سراب، شاعر: شہپر رسول، صفحات: ۸۰، قیمت: ۷۰ روپے، صفحات: ۱۱۲
تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، مبصر: ڈاکٹر منصور عمر، دربھنگہ۔

شہپر رسول نے میدانِ شاعری میں اس وقت قدم رکھا جب جدیدیت کے چراغ کی لو بجھنے سے پہلے شعلہ باز ہو رہی تھی۔ لیکن چوں کہ وہ انتہائی متانت، سنجیدگی، اور نپے تلے قدم کے ساتھ میدان میں اترے اس لئے اس میں گھبراہٹ اور ہڑبڑاہٹ جیسی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔ وہ ماضی سے آشنا اور باخبر ہیں اور حال سے ہم آہنگ اور آنے والے دنوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار وہ نئی غزل کی محفل کے آداب و اطوار اور نشست و برخاست سے بھی پوری طرح آگاہ اور واقف ہیں۔ ان کی اسی واقفیت اور آگاہی نے انہیں نئی غزل کا نمائندہ شاعر بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

شہپر رسول کا پہلا مجموعہ ''صدف سمندر'' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی تھی۔ اب پورے چودہ برس بعد ان کا دوسرا مجموعہ ''سخن سراب'' منظر عام پر آیا ہے جو صرف غزلیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ان چودہ برسوں تک شعر و ادب کی دنیا سے بنواس لئے رہے۔ بلکہ اس دوران پنج وٹی سے ان کے تر و تازہ افکار و خیالات ان کے ہم نواؤں اور چاہنے والوں تک پہنچتے رہے۔ اس دوران تین نثری تصانیف ''پیمانہ صفات، اردو غزل میں پیکر تراشی، آزادی کے بعد اور چشم دروں'' منظر عام پر آئیں۔ ہر چند کہ یہ تصانیف اہمیت کی حامل ہیں لیکن میں انہیں بنیادی طور پر شاعر اور غزل کا شاعر مانتا ہوں۔ انہوں نے ماضی سے فنکاری اور حال سے تازہ کاری کا ہنر سیکھا ہے۔ وہ خوبصورت افکار و خیالات کو حسین و خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنانے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور معنی آفرینی پیدا کرنے کے لئے صنائع کے فن سے بھی واقف ہیں۔

مجھے بھی لمحۂ ہجرت نے کر دیا تقسیم
نگاہ گھر کی طرف ہے قدم سفر کی طرف

مدینہ لکھ کے نیچے جال کے رکھا شکاری نے
کسی طائر کے سینے میں جو ہجرت کا سوال آیا

سی دئے ہونٹ کسی لفظ کے بخیہ گر نے
نذر امروز ہوا سودۂ فردا سارا

ہم اپنی خانہ بدوشی پہ فخر کرتے ہیں
تمہیں تمہارا پرانا مکاں مبارک ہو

ہر اک نئے مکاں کی فضا میں ہے اضطراب
ٹوٹی حویلیوں میں ہے راحت، مگر یہ کیوں

انا کے زخم کو سینا بھی فن تو ہے لیکن
لہو کے تار سے کرتا رہوں رفو کب تک

شہپر صاحب ویرانے سے شہر کی جانب ہجرت
تاریکی میں کوئی پرانا وعدہ چمکا ہوگا

شہپر رسول کبھی کبھی اپنی باتوں کو اتنے سیدھے سادے لب و لہجہ میں کہہ جاتے ہیں کہ قاری کو حیرت بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی گرچہ ان کے یہاں نئے الفاظ و تراکیب بھی مل جاتے ہیں

لیکن وہ دوراز کار افکار وخیالات اور علامات وتشبیہات سے گریز کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار ترسیل وابلاغ کے المیہ سے دوچار نہیں ہوتے ہیں ۔

ترے خیال کا ہونا مرے خیال کے پاس　　فراق و وصل کے معنی بدل کے رکھ دے گا

نہ سنگ آئے کبھی شاخ بے ثمر کی طرف　　نہ اٹھی آنکھ کسی لفظ بے ضرر کی طرف

روایتوں سے بے تکلف نباہ کیوں ہے　　جدید و باغی تو سب ہیں شہپر مگر تمہارا

''سخن سراب'' کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شہپر رسول اپنی جدت پسندی کے باوجود سادگی وسلاست کے قائل ہیں۔ان کے یہاں افکار وخیالات کی فراوانی بھی ہے اورلب ولہجہ اورطرز واسلوب میں نیاپن اور تازگی بھی اور یہی ان کی پہچان ہے۔

نام کتاب: پروفیسر احمد سجاد۔احوال وآثار، مصنف: ڈاکٹر مظفر احمد، صفحات: ۳۰۴، قیمت: ۳۰۰ روپے
ناشر: گہوارۂ ادب، رانچی، مبصر: ڈاکٹر منصور عمر، دربھنگہ۔

استادی اور شاگردی کے رشتے کی روایت بہت ہی قدیم بھی ہے اور بہت ہی توانا اور مضبوط بھی۔ایک زمانہ تھا جب لوگ اپنے بچوں کو پوری طرح سے اساتذہ کے حوالے کردیتے تھے اور ان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتے تھے۔ جہاں اساتذہ نہ صرف یہ کہ بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے تھے بلکہ ان کی تربیت پر بھی پوری پوری توجہ دیتے تھے۔اور جب بچے اپنے اساتذہ سے جدا ہوتے تھے تو وہ مختلف علوم وفنون سے آشنا بھی ہوتے تھے اور تعلیم وتربیت سے آراستہ وپیراستہ ہوکر زندگی کے مختلف مدارج خوبصورتی اور کامیابی سے طے کرتے تھے۔کیوں کہ ہر ہر قدم پر اساتذہ کی دی ہوئی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ ان کی دعائیں بھی شامل حال ہوا کرتی تھیں۔فی زمانہ روایتی تعلیم کا رواج نہیں رہا۔ کیوں کہ نہ تو وہ گرو رہے اور نہ ہی گروکول نہ وہ مولوی رہے اور نہ مکتب۔اب ان کی جگہ اسکول وکالج اور یونیورسٹیوں نے لے لی ہے مادیت پرستی کے اس دور میں روایتی تعلیم کو طلباء اور اساتذہ دونوں نے خیر باد کہہ دیا ہے۔موجودہ عہد میں لوگوں کی توجہ اپنے بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانے پر تو رہتی ہے لیکن ان کی تربیت کی طرف سے وہ بالکل بے نیاز ہو چکے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اخلاقی قدروں کے بحران کے دور سے گذر رہا ہے اور اخلاقیات ایک غیر ضروری چیز ہوکر کے رہ گئی ہے۔ طلباء نہ تو اساتذہ کی عزت افزائی کرتے ہیں اور نہ ہی اساتذہ اپنے شاگردوں کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آتے ہیں۔

ڈاکٹر مظفر مہدی اور پروفیسر احمد سجاد صاحب کے درمیان جو تعلق ہے وہ استادی اور شاگردی کی روایتی اور ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے۔مظفر مہدی نے کسی اسکول، کالج، یونیورسٹی کے

کلاس روم میں بیٹھ کر احمد سجاد سے نہیں پڑھا ہے بلکہ ان کے گھر میں برسوں زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی حاصل کی ہے۔

زیر نظر کتاب ''پروفیسر احمد سجاد، احوال و آثار'' اپنے استاد کی خدمت میں ڈاکٹر مظفر احمد نے خراج تحسین کے طور پر پیش کیا ہے۔ پروگرام کے مطابق اس کو صرف ۶۴ صفحات پر مشتمل ہونا تھا اور ۱۹۹۲ء میں مکمل ہو جانا تھا لیکن بقول مصنف ''میری تساہل کے باعث اپنے وقت پر مکمل نہ ہو سکی'' اب یہ کتاب ۶۴ کے بجائے ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں چودہ عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ ''پیش لفظ، تقدیم اور سرگذشت حیات، علمی و ادبی خدمت، تنقیدی نگارشات، تحقیق، تبصرہ نگاری اور سوانحی و سیرتی مضامین، اداریے، احمد سجاد کے خطوط، دیگر تصانیف، عکس و شخص، شخصیات، کتابیات'' پیش لفظ رانچی یونیورسیٹی میں انگریزی کے استاد ڈاکٹر قیصر ضحیٰ عالم نے لکھا ہے تقدیم مصنف کا مختصر پیش لفظ ہے ''سرگذشت حیات'' عنوان کے تحت ۱۳ ذیلی عنوانات قائم کئے گئے ہیں اور احمد سجاد کی زندگی اور خاندان پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھا عنوان علمی و ادبی خدمات ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس عنوان کے تحت ذیلی عنوانات قائم کئے جائیں اور پانچ سے لے کر نو تک اس کے تحت آئے۔ لیکن مصنف سے غلطی سرزد ہو گئی اور انہوں نے ذیلی عنوانات کو ان کے الگ الگ عنوان کا نام دے دیا۔ دسواں عنوان ''احمد سجاد کے خطوط'' پر مشتمل ہے۔ اس دو ذیلی عنوان قائم کئے گئے ہیں۔ (الف) بنام ڈاکٹر مظفر مہدی وغیرہ۔ ان میں بیس خطوط مظفر مہدی کے نام اور ایک ایک خط پروفیسر محمد مطیع الرحمان صاحب اور پروفیسر عبدالمغنی صاحب کے نام۔ (ب) خطوط مشاہیر بنام احمد سجاد کے تحت ملک و بیرون ملک سے ساٹھ مشاہیر کے آئے ہوئے خطوط کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ سارے خطوط پورے ایک سو صفحات پر محیط ہیں اور کتاب کی ضخامت اور اہمیت بڑھانے میں معاون ہوتے ہیں۔ گیارھواں عنوان دیگر تصانیف کے تحت پانچ کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کو علمی و ادبی خدمات کے تحت کیوں نہیں رکھا گیا عکس و شخص عنوان کے تحت استادی سجاد صاحب کی تصویروں کا البم سجا گیا ہے۔ جس سے ان کی زندگی اور خدمات پر روشنی پرتی ہے۔

اس کتاب کی تیاری اور تصنیف میں مظفر صاحب پروفیسر احمد سجاد سے بھی مشورہ لیتے رہے ہیں۔ مثلاً اپنے ایک خط میں سجاد صاحب فرماتے ہیں۔ آپ نے ''احوال و آثار'' اچھا عنوان دیا ہے اور منصوبہ بندی بھی اچھی ہے۔ انشاء اللہ ایک اچھی تحقیقی چیز ہو گی اور دوسروں کو کچھ ''عبرت'' اور کچھ ''نصیحت'' ملے گی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس کتاب کی اشاعت دوسروں کو نصیحت اور عبرت ملے گی یا نہیں۔ البتہ ہر بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مظفر صاحب خراج تحسین اور تنقید و تحقیق کا حق ادا کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ نیز علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لینے میں مصنف نے بڑی

عرق ریزی سے کام لیا ہے اور مختلف دلائل براہین کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ احمد سجاد صاحب تعمیر پسند ادبی نقاد ہیں جسے بعض لوگوں نے اسلامی ادب کے نام سے موسوم کیا ہے۔

بہر حال اخلاقی قدروں کے اس بحران دور میں جب کوئی شاگرد اپنے استاد کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہو تو یک گونہ خوشی ہوتی ہے کہ ابھی ہمارے معاشرہ سے اخلاقی قدریں پوری طرح سے ختم نہیں ہوئی ہیں۔ قابل مبارکباد ہیں ڈاکٹر مظفر صاحب کہ وہ اپنے شفیق استاد پروفیسر احمد سجاد صاحب کی خدمت میں ایک ایسا نذرانہ لے کر حاضر ہوئے ہیں جو رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گا۔

نام کتاب: مغیث الدین فریدی اور قطعات تاریخ، مصنف: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، صفحات: ۲۶۰
قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ استعارہ، جامعہ نگر، نئی دہلی، مبصر: ڈاکٹر منصور عمر، دربھنگہ۔

تاریخ گوئی کی روایت اردو شاعری کی روایت سے ہم آہنگ رہی ہے چنانچہ عہد غالب کو فن تاریخ گوئی کا سنہرا دور کہا جاتا ہے لیکن بیسویں صدی کے صنف آخر سے یہ صنف سخن شعراء کی بے توجہی کا شکار ہونے لگی اور رفتہ رفتہ ہمارے شعراء فن تاریخ گوئی سے نابلد ہوتے چلے گئے۔ اور آج حال یہ ہے کہ اس صنف سے واقفیت رکھنے اور اسے برتنے والے شعراء انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ناوک حمزہ پوری شارق جمال ناگپوری، نادم بلخی اور پروفیسر طلحہ رضوی برق وقت ضرورت قطعات تاریخ لکھتے رہے ہیں۔ ادھر حالیہ برسوں میں پروفیسر عبدالمنان طرزی کے قطعات تاریخ سہ ماہی تمثیل نو دربھنگہ کے ہر شمارے میں ''قطعات تاریخ بروفات مشاہیر ادب'' کے عنوان سے شائع ہو رہے ہیں اور کبھی کبھی یہ خاکسار منصور عمر بھی قطعات تاریخ کہہ لیا کرتا ہے۔ تاریخ گوئی سے بے توجہی کی وجہ دراصل اس صنف سے عدم واقفیت بھی ہے اور اس کی مشکل پسندی بھی۔ وہ شعراء جو اس فن سے ناواقف ہیں ان کا تو خیر کہنا ہی کیا لیکن جو شعراء واقفیت رکھتے ہوئے بھی صرف نظر کرتے ہیں وہ دراصل مادہ تاریخ نکالنے کی پریشانی سے گھبراتے ہیں اور اسے تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارے ادب میں بعض شعراء ایسے بھی ہوئے ہیں جو اس فن کے شہسوار کہلانے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس صنف کو نہ صرف یہ کہ باضابطہ صنف سخن کی طرح برتا ہے بلکہ اسے پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ ایسے ہی ماہر فنکاروں میں حسرت عظیم آبادی، مولانا خیر رحمانی، سیماب اکبرآبادی، پروفیسر حامد حسن قادری اور ڈاکٹر مغیث الدین فریدی کا بھی شمار ہوتا ہے۔

زیر نظر تصنیف ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی گرانقدر اور بے مثال کتاب ہے جو درج ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب سوانحی کوائف سے متعلق ہے۔ دوسرا باب فریدی صاحب سے شیخ عقیل احمد کا لیا ہوا انٹرویو

پر مشتمل ہے جس سے فریدی صاحب کی شخصیت اور شاعری کی مختلف جہات سے آشنائی ہوتی ہے۔ تیسرے باب میں یادیں عنوان کے تحت فریدی صاحب کے مختلف اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھے باب میں فن تاریخ گوئی کی روایت سے بحث کی گئی ہے اور فن تاریخ گوئی میں فریدی صاحب کا مقام اور مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں فریدی صاحب کے قطعات کو مختلف موضوعات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے مثلاً۔

(ا) وہ قطعات جو بزرگان دین سے متعلق ہیں یا جن کا تعلق مذہبی عقائد سے ہے (ب) وہ قطعات جن کا تعلق فریدی صاحب کی ذات سے ہے (ج) وہ قطعات جو خوشی اور مسرت کے موقع پر کہے گئے ہیں (د) مزاحیہ قطعات (ہ) قطعات تاریخ وفات۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عقیل احمد نے ان قطعات کی چھان پھٹک اور ترتیب و تشکیل میں کتنی عرق ریزی سے کام لیا ہوگا۔ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ چوتھا باب ہے جس میں فن تاریخ گوئی کی مختلف روایات اور ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے بقول مصنف ''ایک روایت کے مطابق حروف کی قیمت سب سے پہلے حضرت آدمؑ پر منکشف ہوئی جو ابجد آدم کہلائی بعد میں ابجد ایک نئی صورت میں حضرت نوحؑ پر منکشف ہوئی جو ابجد نوحی کے نام سے مشہور ہوئی اور یہی تاریخ گوئی کی بنیاد بنی۔ ایک دوسری روایت کے مطابق ابجد حضرت ادریسؑ پر اور تیسری روایت کے مطابق حضرت شیثؑ پر نازل ہوئی۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ حضرت علیؓ کے ایک شاگرد ابو ادریس احمد بن احمد کوفی نے ابجد ایجاد کیا تھا۔''

مصنف کو اس بات کا احساس ہے کہ ان تمام روایتوں کی بنیاد عقیدوں پر ہے اور تاریخی اور تحریری شواہد کی روشنی میں اب تک کوئی تحقیق عمل میں نہیں آئی ہے' انہوں نے انگریزی '' کرونو گرام'' اور سنسکرت ''سنکیت ودیا'' پر بھی ہلکی سی روشنی ڈالی ہے۔ لیکن چوں کہ اردو تاریخ گوئی کی بنیاد عربی ابجد پر ہے جس کی ترتیب میں آٹھ بامعنی کلمے ہیں اس لئے انہوں نے اسے ہی بنیاد بنایا ہے۔ اور ان آٹھ کلموں کے سلسلے میں لغات میں جن روایات کا ذکر کیا گیا ہے انہیں اس طرح پیش کیا ہے'' ایک روایت کے مطابق اباجاد نامی ایک بادشاہ تھا، اسی کے نام کا مخفف ابجد ہے اور باقی سات کلمے اس کے سات بیٹوں کے نام ہیں۔ دوسرا روایت یہ کہ مرامر نامی ایک شخص نے لکھنا ایجاد کیا اور یہ آٹھوں کلمے اس کے آٹھ بیٹوں کے نام ہیں بعض علماء کے مطابق وہ آٹھوں کلمے سلاطین کے ناموں سے تعبیر ہیں'' پھر تاریخ نکالنے کے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اردو میں اُردو فریدی صاحب کے یہاں تاریخ نکالنے کے تینوں طریقے (سالم الاعداد، تعمیہ تدخلہ، اور تعمیہ تخرجہ) سے کام لیا گیا ہے۔

شیخ عقیل احمد نے فریدی صاحب کے تقریباً پونے دوسو تاریخی قطعات کو یکجا کر دیا ہے۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سب سے پہلا قطعہ تاریخ ۱۳۸۷ھ یعنی ۱۹۶۷ء میں کہا تھا جب وہ پورے اکتالیس سال کے ہو چکے تھے۔ اور آخری قطعہ ۱۴۲۱ھ یا ۲۰۰۰ء میں کہا ہے

جب کہ ۱۵ جولائی ۲۰۰۱ کو فریدی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ گویا فریدی صاحب کی تاریخ گوئی پورے ۳۴ برسوں پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے فن تاریخ گوئی میں بے شمار گل و بوٹے کھلائے ہیں اور اس صنف کو خوبصورت الفاظ و تراکیب اور حسن کاری و مرصع سازی سے مالا مال کر دیا ہے۔

بہر کیف! شیخ عقیل احمد ایک تازہ کار قلم کار ہیں اور تنقیدی و تحقیق حلاصیتوں سے بہرہ ور، اس سے قبل ان کی دو کتابیں ''فن تضمین نگاری اور غزل کا عبوری دور'' منظر عام پر آ چکی ہیں اور داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب گرچہ ایک مشکل موضوع پر ہے لیکن شیخ عقیل احمد اسکی ترتیب و تدوین اور تحقیقی مراحل سے جس حسن و خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فن تاریخ گوئی کی تمام تر کنہیات سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی نثر بیحد رواں دواں اور عام فہم ہوتی ہے اور ان کے اسلوب میں فنی رچاؤ اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ قابل مبارکباد ہیں شیخ عقیل احمد کہ اس اکیسویں صدی میں جب کہ استاد و شاگرد کے درمیان عزت و محبت کا رشتہ تقریباً ختم ہو چکا ہے انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے استاد کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا بلکہ ان کے خوابوں کو تعبیر عطا کی اور ان خوابوں میں رنگ بھرنے کی کوشش میں کامیاب و کامران ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں شرف قبولیت بھی حاصل کرے گی اور ایک لائق شاگرد اور شفیق استاد کے نام اور کام کی ضامن بھی ہوگی۔

نام کتاب: جذبی شناسی، مصنف: ڈاکٹر مشتاق صدف، صفحات: ۲۱۶، قیمت: ۱۷۰ روپے

ناشر: استعارہ پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵، مبصر: ڈاکٹر منصور عمر، دربھنگہ۔

جذبی کا شمار ان بڑے ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے جو ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی ترقی پسندی کا رائج الاپنے سے گریز کرتے رہے۔ اور مارکسی نقطۂ نظر کا حامی ہونے کے باوجود پروپگنڈائی ادب پیش کرنے کے بجائے اپنے افکار و خیالات کو عریاں اور برہنہ ہونے سے محفوظ رکھنے کامیاب ہوئے۔ جذبی کو فن کی عظمت کا احساس تھا اس لئے انہیں روایتی اور کلاسیکی لچھمن ریکھاؤں سے باہر نکلنے کی نہ تو خواہش ہوئی اور نہ انہوں نے کوشش کی۔ ان کی شاعری مقصدی ضرور ہے لیکن ان کے مقاصد پر افکار و خیالات کی ندرت اور اسلوب کی تازگی غالب ہے۔ جذبی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی دلفریبی اور دلکشی، نرمی اور حلاوت سے پوری طرح آگاہ، اسی لئے انہوں نے غزل کے روایتی آداب کے کبھی بھی سر مو انحراف کی جرأت نہیں کی۔ انہوں نے فکر و فن اور کلاسیکیت اور ترقی پسندی کے درمیان اعتدال و توازن برقرار رکھا اس لئے ان کی شاعری سچی اور حقیقی شاعری معلوم ہوتی ہے نیز یہ کہ وہ اپنی اعتدال پسندی سادہ لوحی اور افتاد طبع کی وجہ سے بھی ترقی پسندی کی ہنگامہ خیزی سے خود کو ہم آہنگ نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اختر انصاری کی طرح جذبی کو بھی ٹاٹ باہر کر دیا گیا۔ اور جذبی منظر سے ایسے غائب

ہوئے کہ قارئین کے نظروں میں مرحوم ومغفور ہو گئے ۔ زیر نظر تصنیف ''جذبی شناسی'' کے جواں سال مصنف مشتاق صدف نے انتہائی لگن، محنت، جستجو ہمت اور حوصلہ کا ثبوت دیتے ہوئے تعصب اور تنگ نظری کی دھول مٹی میں دبے اور تنہائی کی قید میں پڑے ہوئے شاعر کو ذات کے خول کے باہر نکالنے اور جھاڑ پونچھ کر کے ادبی منظر نامے پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مشتاق صدف نے جذبی شناسی کا صدف صرف مبادہ نہیں اوڑھا اور نہ ہی محض ڈگری حاصل کرنے کے لئے یہ تحقیقی مقالہ لکھا ہے بلکہ جذبی کی شخصیت اور ذاتی زندگی کے نہاں خانوں میں جھانکنے اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ جذبی کی شخصیت اور شاعری میں مطابقت اور ہم آہنگی کا بہت ہی باریک بینی سے مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے اور ایک منجھے ہوئے نقاد کی طرح اپنا حتمی فیصلہ بھی صادر کر دیا ہے کہ ''جذبی کا کلام انسان کے پاکیزہ خوابوں اور مقدس آرزؤں کا ترجمان ہے اور زندگی کے احترام کا آئینہ دار بھی۔''

اس کتاب میں یوں تو کئی ابواب قائم کئے گئے ہیں لیکن شروع کے چار ابواب ''جذبی حالات زندگی اور عصری تناظر، جذبی کی غزلیہ شاعری، جذبی کی نظمیہ شاعری اور جذبی کی شاعرانہ قدر وقیمت، ہی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ''جذبی روبرو'' (جذبی سے مشتاق صدف کا لیا گیا انٹرویو) بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس چھوٹے سے انٹرویو کے ذریعہ جذبی صاحب کی ذاتی اور ادبی زندگی کے کئی گوشے منور ہوتے ہیں۔ ''جذبی مشاہیر کی نظر میں'' اس بات پر دال ہے کہ دیر سے ہی سہی ان کے ہم عمر اور ہم عصروں کو ان کی شعری عظمت کا اعتراف کرنا پڑا'' جذبی اور نئی نسل'' اس بات کا اشاریہ ہے کہ مشتاق صدف نے نئی نسل کو مجبور کیا کہ وہ جذبی کو پڑھیں اور اپنے خیالات کا اظہار کریں یا پھر یہ کہ نئی نسل بھی اب جذبی کے نام اور کام سے غافل نہیں ہے۔ اور'' انتخاب کلام اس بات کا ثبوت ہے کہ مشتاق دصدف نے جو دعوی اور فیصلہ کیا ہے وہ بے بنیاد نہیں ہے، ہر چند کے مشتاق صدف نئے لکھنے والے ہیں لیکن وہ اپنے خیالات کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں اور ان کی نثر رواں دواں اور شگفتہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی باتوں کی ترسیل کامیابی سے کرتے ہیں۔ اور اپنے اسلوب کو تنقید کی گرختگی سے بوجھل نہیں ہونے دیتے ہیں، امید ہے کہ مشتاق صدف کی ''جذبی شناسی'' اردو کے تنقیدی ادب میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوگی اور جذبی پر قلم اٹھانے والوں کے لئے سنگ میل ثابت ہوگی۔

نام کتاب: مسافت ہجراں، شاعرہ: نسیم مخموری، صفحات: ۸۰، قیمت: ۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: خیاباں، B-300 اوکھلا، نئی دہلی ۔ ۲۵، مبصر: ڈاکٹر منصور عمر، دربھنگہ۔

اردو شعر وادب کی تاریخ خواتین کے کارناموں سے کبھی بھی خالی نہیں رہی ہے۔ لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد ان کی تعداد میں معتد بے اضافہ ہوا ہے اور وہ شعر وادب کے ایک اہم حصہ کے طور پر سامنے آئی

ہیں۔ نسیم مخموری کا تعلق بھی اسی نسل سے ہے۔ انہیں شعروادب ورثہ میں ملا ہے۔ وہ معروف شاعر مخموری دہلوی کی صاحب زادی ہیں۔ اور دہلوی تہذیب کی پروردہ بھی ہیں اور نمائندہ بھی۔

''مسافت ہجراں'' نسیم مخموری کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کی دو کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ''صدف'' (شعری مجموعہ) اور ''مخموری دہلوی حیات وشاعری'' مسافت ہجراں اسم با مسمی ہے۔ اس میں دو نعت اور تقریباً ستر نظمیں ہیں اور یہ سب کی سب آزاد ہیں۔ ان میں کئی نظمیں ایسی ہیں جو ''سفر'' عنوان کے تحت مذکور ہوئی ہیں مثلاً طویل سفر کا ایک لمحہ، کرب کا سفر، ہم سفر'' اور کچھ نظمیں ان کے احساسات وجذبات کے کرب سے مملو ہیں مثلاً'' کرب کا سفر، ظلم کا کرب اور روح کا کرب وغیرہ، نسیم داخلی وخارجی کرب سے دوچار نظر آتی ہیں اور وہ مسلسل سفر کے عمل سے گذر رہی ہیں۔ چاہے وہ سفر جستجو کا ہو یا ذات وکائنات کا، چاہے وہ سفر تنہائی کا ہو یا ہم سفر کی یادوں کی خوشبو کے ساتھ۔ نظم ''زلزلہ'' آفات خداوندی سے متاثر ہو کر لکھی گئی تو'' نظم (گجرات) پر بچہ کی فکر (گجرات) اور قیامت صغری'' انسانی درندگی کی منھ بولتی تصویروں کو اجاگر کرتی ہیں اور ''سچائی کے رنگ'' سیکولر ذہنیت آپسی میل جول اور اخوت ومحبت کی آئینہ دار ہے ان کے علاوہ کئی خوبصورت نظمیں ہیں جو قارئین کو اپنی طرف متوجہ بھی کرتی ہیں اور متاثر بھی مثلاً ''خبر، ماں کی یاد میں، عورت، لمحوں کے پھول، فریب اظہار، بے خوابی، گڑیا، میری تصویر، دل وغیرہ۔

''مسافت ہجراں'' کا انتساب بھی اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔ ''خدا کی اس عظمت اور رحمت کے نام جس کو دل کہتے ہیں'' یہی وجہ ہے کہ یہ تمام نظمیں دماغ سے زیادہ دل سے قریب معلوم ہوتی ہیں۔

بہرکیف! ''مسافت ہجراں'' کی کمپوزنگ اور طباعت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے جو پہلی ہی نظر میں دامن دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور نگاہوں کو راحت پہنچاتی ہے مگر مطالعہ کے دوران اندازہ ہے ہوتا ہے کہ شاعرہ نے اس کی ترتیب انتہائی بے دلی سے کی ہے اور پروف ریڈنگ تو سرے سے کی ہی نہیں گئی چنانچہ اس خوبصورت کتاب میں بے پناہ غلطیاں راہ پائی گئی ہیں اور ترتیب کی بے دلی کا اندازہ اس امر سے بھی ہوگا کہ ایک ہی نظم تین مختلف عنوانات سے تین مختلف صفحات پر شائع ہوئی ہیں مثلاً صہ ۱۶ پر ایک نظم ہے ''ہم قدم'' جو ۱۶ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ یہی نظم صہ ۲۷ پر ''سفر'' کے عنوان سے اور صہ ۵۴ پر ''تمہاری راہوں پر'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ ہم قدم اور تمہاری راہوں پر میں سولہ سولہ مصرعے ہیں۔ جب کہ ''سفر'' میں ۱۵ مصرعے ہیں اور یہ مصرعہ ''قریب تھا مرے، جیسے مری رگ جاں ہو'' غائب ہے، ہم قدم کا آخری مصرعہ اس طرح ہے ''میں ہم قدم رہوں اس کی مسافت جاں میں'' جب کہ سفر کا آخری مصرعہ اس طرح ہے ''سفر کروں میں ہمیشہ اسی کی راہوں پر'' اور تمہاری راہوں پر۔ آخری مصرعہ میں ایک لفظ بدلا ہوا ہے ''سفر کروں میں ہمیشہ تمہاری راہوں کا'' جو طبیعت پر گراں گذرتا ہے۔ میں سمجھتا

ہوں کہ ظاہری آرائش کے ساتھ ساتھ اگر داخلی تزئین پر بھی توجہ دی جاتی تو یہ کتاب زیادہ کارآمد ہو سکتی تھی۔ نسیم اپنے سینے میں ایک حساس اور باشعور عورت کا دل رکھتی ہیں اور وہ رشتوں کے تمام نشیب و فراز طے کر چکی ہیں (بیٹی، بہن، بیوی، ماں، دادی وغیرہ) اس لئے ان رشتوں کی حلاوت اور کڑواہٹ ان میں موجود ہے۔ نیز یہ کہ ان کی ذاتی زندگی نہ تو نشاط آگیں ہے اور نہ اطمینان بخش۔

نام کتاب: منٹو کا سرمایۂ فکر و فن، مصنفہ: ڈاکٹر نگار عظیم، صفحات: ۲۳۳، قیمت: ۱۸۰ روپے
رابطہ: ایچ ۸۔ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵، مبصر: ڈاکٹر منصور عمر، دربھنگہ۔

سعادت حسن منٹو اردو کے بدنام ترین اور متنازعہ فیہ افسانہ نگار گذرے ہیں۔ اگر ایک طرف انہیں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا تو دوسری طرف شہرت و مقبولیت نے بھی ان کے قدم چومے۔ پریم چند سے لے کر آج تک کسی بھی افسانہ نگار کو جیتے جی وہ عظمت و سربلندی نصیب نہ ہوئی جو منٹو نے محض بیالیس سال کی قلیل عمر میں حاصل کر لیا۔ منٹو کے افسانے چوں کہ ہندوستانی سماج و معاشرہ کی عریاں حقیقت نگاری کے آئینہ دار ہیں اس لئے قارئین کا ایک طبقہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے اور دوسرا طبقہ اس سے محظوظ بھی ہوتا ہے اور انہیں گھناؤنا کہہ کر نظر انداز بھی کر دیتا ہے البتہ ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ ان افسانوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اور افسانہ نگار کے جذبۂ خلوص کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

نگار عظیم صاحبہ بھی اسی تیسرے گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ چوں کہ وہ خود ایک افسانہ نگار ہیں اور افسانہ نگاری کی تخلیقی بُنت سے پوری طرح واقف ہیں اس لئے انہوں نے بہت ہی باریک بینی سے منٹو کے فکر و فن کا مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے اور ان پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اور ان کا منصفانہ جائزہ لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ منٹو کے موضوعات اگر متنوع نہیں ہیں تو بہت محدود بھی نہیں ہیں۔ نفسیات، جنسیات، سیاسیات، سماجیات، فسادات اور طوائفوں کے کوٹھے وغیرہ۔ لیکن منٹو نے ان موضوعات پر اتنے زاویوں سے روشنی ڈالی ہے کہ ان کا کوئی بھی گوشہ تاریکی میں نہیں رہ پاتا ہے اور ان تمام موضوعات کو نگار عظیم نے منٹو کی تعلیم و تربیت اور اور شب و روز کے آئینہ میں رکھ کر دیکھا ہے اور بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "منٹو کا ادب نہ تو کسی پرپیگنڈے سے وابستہ تھا اور نہ کسی قسم کی اصلاح یا اخلاقی نظریات پر مبنی تھا۔ منٹو نے سماج کو جیسا دیکھا اور جیسا دیکھنا چاہا ویسا ہی اپنے قارئین کو دکھا دیا۔" نگار عظیم نے منٹو کے دس افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ ہے کچھ معروف افسانوں پر ان کے ریمارکس ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ لگائیں کہ نگار عظیم کا تجزیہ صداقت پر مبنی ہے یا جانبداری پر۔

ا۔ "بو" فطرت کے راز کا ایک حسین شاہکار ہے جہاں انسانی فطرت کو تمام زیبائش سے پاک

حقیقتوں کی تلاش ہے۔۲۔ٹھنڈا گوشت ...... ایشر سنگھ کی اس پاک روح کا ثبوت ہے جو حیوانیت کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ جس کے وجود سے ہی انسانیت زندہ ہے، فطری طہارت باقی ہے جو انسانی ضمیر سے بھی بالاتر ہے جو اپنے خلاف کئے ہوئے جرم کی عبرت ناک سزا دیتی ہے۔''۳۔''کھول دو پر سکینہ کا ردعمل صرف سکینہ ہی کو نہیں تمام انسانیت کو ننگا کر دیتا ہے...... دوپٹہ کا گرنا سکینہ کے بے آبرو ہونے کی علامت بن جاتا ہے اور کھول دو کے دولفظ انسانیت کے بے آبرو ہونے کی'' ۴۔''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' منٹو کا وہ شاہکار ہے جسکا اندازہ شاید منٹو کو بھی نہیں تھا۔ منٹو کی فکری بصیرت کا یہ اچھوتا نمونہ ایک ایسا پیغام دے جاتا ہے کہ قاری سیاسدانوں کی عقل کی معقولیت کا جواز نہیں ڈھونڈ پاتا دیوانگی کے عالم میں فرزانگی کا پیغام دینا منٹو جیسے فنکار کا ہی حصہ ہے۔''۵۔منٹو کا یہ نطفہ تاریخ، سماج اور معاشرے کا نطفہ ہے۔ اس کا تعلق عورت کے بطن سے نہیں، بلکہ ملک کے حکام اور اس کے ٹھیکیداروں سے ہے۔ اس نظام سے جس میں سرکاری اور نیم سرکاری پیشہ ور بھڑوے اور دلال اس کی آبیاری کرتے ہیں۔''

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نگار عظیم نے منٹو کے افسانوں کی تہوں میں اتر کر اس کی جڑیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور مطالعہ کے دوران افسانہ نگاری کی تمام تر جزئیات پر روشنی ڈالی ہے۔ چاہے وہ جذبات نگاری ہو یا منظر نگاری، جزئیات نگاری ہو یا کردار نگاری یا ان کے افسانوں میں تشبیہات و استعارات کا استعمال، تکرار و تضاد اور طنز کی کاٹ۔ نگار نے کوئی بھی گوشہ خالی نہیں چھوڑا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ منٹو نے اپنے افسانوں کی تخلیق میں جس جرأت مندی اور بیباکی کا ثبوت دیا ہے۔ نگار عظیم نے ان کی تفہیم و تعبیر میں اسی جرأت اور بیباکی سے کام لیا ہے۔ امید ہے کہ کتاب ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

نام کتاب: زمین لاپتہ رہی، شاعر: ڈاکٹر حنیف ترین، صفحات: ۱۶۸، قیمت: ۱۵۰ روپے
تقسیم کار: کمپیوٹر سیٹی، راجباغ، سرینگر، مبصر: ڈاکٹر منصور عمر، دربھنگہ۔

حنیف ترین اردو شعر ادب کا جانا پہچانا نام ہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے معالج ہیں۔ لیکن شعری تہذیب ان کے رگ و ریشے میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ شاعری ان کی شناخت بن گئی ہے۔ اور حرف و صوت کے وسیلے سے انہوں نے ایک جہان معنی آبیاری کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وہ لفظوں کی پرکھ اور اس کی تراش خراش میں بڑی مہارت رکھتے ہیں اور پھر ان کا استعمال وہ من چاہے طریقہ سے کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی نثر کا مور قدرت کے مضبوط ستون کے باندھ رکھا ہے اور اس محور مانتے ہوئے دور سرا سرا ہاتھ میں لے کر اس محور و مرکز کی روشنی میں کائنات کی سیر کرتے نظر آتے ہیں اور شاید اس دین کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہیں جو ابتک لاپتہ رہی ہے۔

''زمین لاپتہ رہی'' حنیف ترین کا پانچواں مجموعہ کلام ہے جو ان کے نادر کلام ہونے کا

ٹھوس ثبوت ہے۔ یہ نام کچھ رٹ پٹا سا ضرور لگتا ہے لیکن مطالعہ سے بعد اس کی گر ہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور قاری شاعر کی لاپتہ زمین سے روشناس ہو جاتا ہے۔ حنیف ترین کا دماغ عرش پر ہے لیکن قدموں سے فرش ناپنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ نہ تو وہ روایت سے ناآشنا اور غافل ہیں اور نہ جدت پسندی کے اسیر اور نا...... جدیدیت کے پرستار و بلکہ انکی شاعری قدرت اور کائنات کے حسین ترین اور جھش آفریں رنگوں کی آمیزش سے عبارت ہے۔ یہی شجہ ہے کہان میں قوس قزح کی رنگین، کہکشاں کی جگمگ ہٹ چاندنی کی ٹھنڈک اور دھوپ کی تمازت کا احساس جاگزیں ہوتا ہے۔ اردو اور فارسی کے پیشتر شعراء نے چڑیوں کی چہچہاہٹ اور مرغ کی بانگ کو سحر خیزی کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ''زمین لاپتہ رہی'' کی پہلی نظم کا عنوان ''عرفان'' ہے جن میں شاعر نے فجر کی اذان کے مخصوص بولی ''الصلوۃ خیر من النوم'' کے ترجمہ کو سحر خیزی کی علامت قرار دیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

''تھی عجب صبح مبارک/ واللہ اللہ کی صدا/ جاگی سونے سے اچھا/ آؤ آؤ کی ندا (عرفان)

یا پھر سے ''تنہائی میں گنہ سے روکے/ مجھکو بھری محفل میں ٹوکے/ خالی من میں خوشیاں بھر دے/ درد والم غافل کردے (مذہب) جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے دین و مذہب سے حنیف ترین کا تعلق کتنا گہرا اور مضبوط ہے۔ یوں تو حنیف کی ک پیشتر نظمیں مختصر اور مختصر ترین ہیں لیکن تین طویل نظمیں بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان میں ایک خیال آتا ہے۔ سب سے طویل ہے اور بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں شعور کی ایک دو ہے خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اس میں نہ جانے کسی آرزوئیں ہیں کتنی تمنائیں ہیں...... شکایتیں ہیں تأمل ہیں فکراتے ہے ل خوشیاں اور غم ہیں۔ جوف و دحشت ہے سکون کی تلاش ہے جذبات واحساسات...... مارتا ہوا سمندر ہے میں اسے اس مجموعہ کی کامیاب ترین نظم مانتا ہوں۔ ''پردیسی جب گھر لوٹا تھا'' اور ایک نظم صلاح...... پرویز کیلئے بھی طویل نظمیں ہیں اور متاثر آتی ہیں۔ ان کے علاوہ ''بند گھروں سے کٹی زبانیں لٹکی ہیں'' دہ دھاری، جب ترسیل بٹن...... ایسا کیوں ہوتا ہے، روبولی تہذیب چمکتی دوری ہے، خواہش بازو پھیلاتی ہے، اپنا رستہ...... سچا لگتا ہے ڈش انٹینا،، وغیرہ اچھی نظمیں ہیں اور دعوت غور وفکر دیتی ہیں۔ اس مجموعہ کی غزلیں بھی مختلف اور متنوع موضوعات اور نئے معنیاتی نظام کی حامل ہیں۔ اس ضمن میں ان کا نہ خیال بالکل صحیح ہے کہ ؎

میرے لفظوں میں روانی اور ہے	دردِ دل کی یہ کہانی اور ہے
معاشیاتی ہواؤں کی یورشوں پر بھی	ادب کا کیمیا بکھرا تو طشت زر میں رہا
ہوا کے ساتھ رہی دیو قامتی اس کی	وہ جس کا زورِ قلم اپنے ہی ہنر میں رہا
تابش حرف و صوت سے بڑھ کر	زندگی میں کوئی جمال کہاں
حنیف کھو گئے بے معنی اشعاروں میں	غزل کو جن رہی آن بان کی خواہش

مری تخلیق وجہ ارتقائے فن رہی ہے　　لکیروں کے فقیروں سا سخنور میں نہیں ہوں

جس کا ہر لفظ بولتا ہے حنیف　　اس غزل کی بڑی ستائش ہے

کچھ اشعار افکار و خیالات سے متعلق بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

ہر جگہ پتھروں کی بارش ہے　　سر دعاؤں سے ڈھک لیا جائے

میں ہواؤں کا تیز جھونکا ہوں　　کوئی روکے مجھے مجال کہاں

صحرا کی بشارت یہ بھی شاہین سے ڈرے　　باتوں میں زباں سے کبوتر نہیں آیا

مجھ یہ کہتے ہیں کوئی تامل نہیں کہ حنیف ترین کی شاعری...... تھا۔ اور خیالات کی تازگی اور جدید تر اسلوب اور طرز ادا گی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں منفرد بھی نظر آتی ہے اور ممتاز بھی ، انکی شاعری ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی ''زمین لاپتہ رہی'' کی شکل میں نمودار ہوئی ہے۔ یہ مجموعہ جدید ترین شعری سرمائے میں اضافہ بھی ہوگا اور اعتبار حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوگا۔

نام کتاب: دستارِ طرح دار، شاعر: ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، صفحات: ۱۱۲، قیمت: ۱۰۰ روپے
اشاعت: ۲۰۰۳ء، ملنے کا پتہ: نرالی دنیا پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲، مبصر: ڈاکٹر عبیدالرحمٰن، پٹنہ۔

عبدالمنان طرزی ایک فعال اور متحرک شاعر ہیں۔ انہیں شاعری کی تمام اصناف پر قدرت حاصل ہے۔ مصنف کی ایک حالیہ تصنیف ''رفتگاں و قائماں'' ایک ایسا ادبی کارنامہ ہے جس کے مطالعہ سے ان کی قادرالکلامی اور تذکرہ نگاری پر دسترس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں پیش نظر تصنیف دستارِ طرح دار بھی آتی ہے جس میں شہر دربھنگہ سے تعلق رکھنے والے ہندوستان کے معروف شاعر اور صاحبِ طرز نثر نگار مظہر امام کے فکر و فن کا منظوم جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مظہر امام کے فن پر یوں تو متعدد لوگوں نے لکھا ہے کبھی مضامین کی صورت تو کبھی کتاب کی شکل میں۔ مگر عبدالمنان طرزی کی یہ کتاب اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔ یہاں مظہر امام کے فکر و فن کے تقریباً تمام گوشوں کو قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں مظہر امام کی شخصیت کے پہلو بھی اجاگر ہوئے ہیں، ان کی نرم مزاجی اور اخلاص پسندی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

مصنف نے باب اول میں خدا کا شکر بجالاتے ہوئے اظہار کے لئے توفیق کی دعا بھی مانگی ہے۔ باب دوم (الف) میں مظہر امام کی پیدائش کے ذکر کے ساتھ کے والدین اور رشتہ دار کا تذکرہ شامل ہے اور ساتھ ہی دربھنگہ کی شعری فضا کی طرف بھی اشارے ہیں۔ باب دوم (ب) ملازمت اور شادی کی داستان ہے، ساتھ ہی مختلف مقامات پر مظہر امام کے ٹرانسفر، صدر جمہوریہ ہند اور دیگر معززین سے ملاقات کا اشاریہ بھی۔ باب دوم (ج) مظہر امام کی مختلف تصنیفات پر محیط ہے اور

انعامات واعزازات کا بیانیہ بھی باب سوم ایک منفرد حصہ ہے۔ جس میں مظہر امام کے تئیں ۱۳۵ مختلف ادباء شعرا اور ناقدین کی آراء شامل ہیں ساتھ ہی جن حضرات نے مظہر امام کے انٹرویوز لئے ہیں اس کی طرف بھی اشارے کردئے گئے ہیں۔ باب چہارم میں مظہر امام کی فنکارانہ حیثیت کے تعلق سے فراق گورکھپوری کی تنقیدی رائے کو بنیاد بناتے ہوئے صنعتِ توشیح کے تحت ۱۳۹ اشعار بعد از تمہید کہے گئے ہیں۔ رائے میں شامل ہر حرف سے ایک شعر کہتے ہوئے مظہر امام کی شخصیت، فن اور اسلوب پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی بلیغ کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کی خوبصورتی اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہاں پیش لفظ بھی منظوم ہے جسے ڈاکٹر منصور عمر نے بڑی ہنرمندی اور جذبات آفریں لہجے میں قلم بند کیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر امام اعظم نے 'دولتِ قلم' عنوان کے تحت مظہر امام کے تئیں اپنے خلوص وعقیدت کا بڑے سلیقے سے اظہار فرمایا ہے اور صاحب کتاب کو مبارکباد پیش کی ہے۔ کتاب کے آخر میں ڈاکٹر منصور عمر کا قطعۂ تاریخ برسالِ تصنیف شامل ہے۔ باب پنجم 'نذر بہ امام' کے تحت اردو اشعار کو محیط ہے۔ باب ہفتم میں حواشی درج ہیں جو نہ صرف قاری کے لئے مفید ہیں بلکہ ان کی ایک دستاویز کی سی حیثیت ہے۔

یہاں میں کتاب کے کسی حصے سے اشعار نقل نہیں کررہا ہوں کہ پوری کتاب ایک زنجیر کی صورت ہے اور اس میں جو روانی اور سلاست ہے اس کا بھرپور مزہ ایک ساتھ پڑھنے میں ہے۔

عبدالمنان طرزیؔ صاحب کی شاعرانہ برتری اور زبان وبیان پر مکمل دسترس کا میں پہلے سے ہی قائل رہا ہوں۔ لہٰذا یہ کتاب بھی میرے اس یقین کو مزید پختہ کرنے کا سبب بنی ہے۔ طرزی صاحب اس کاوش کے لئے لائق تحسین اور قابل مبارکباد ہیں۔

کتاب میں مصنف کے تئیں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر احمد سہیل کے تاثرات نثر میں درج ہیں اور ابومحفوظ الکریم معصومی کی منظوم رائے شامل ہے۔ کتاب کی طباعت صاف ستھری اور روشن ہے۔ سرورق سادہ مگر پرکشش ہے۔ پشت کور پر مصنف کی تصویر ایک خوبصورت شعر کے ساتھ آویزاں ہے۔ اس دستاویزی حقیقت کی حامل کتاب کی قیمت صرف سو روپے نہایت مناسب ہے۔

نام کتاب: غنچہ پھر لگا کھلنے، شاعرہ: حلیمہ سعدیہ شگفتہؔ، صفحات: ۱۴۴، قیمت: ۱۵۰ روپے

ناشر: نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی، مبصر: ڈاکٹر عبیدالرحمٰن، پٹنہ۔

'غنچہ پھر لگا کھلنے' حلیمہ سعدیہ شگفتہؔ کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے جس میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے اور نظمیں کم۔ شگفتہ کی شاعری ہم تک رسائل کے حوالے سے بہت کم پہنچ پائی ہے اگر وہ یہ سلسلہ تیز رکھتیں تو اس کتاب کے آنے تک ان کا نام لوگوں کی زبان پر ہوتا۔ بہرحال میں ان کے

اس شعر سے بہت پُر امید ہوں کہ ۔

دیر تو اس نے لگادی ہے شگفتہ لیکن صبح کے بھولے مسافر کا میں رستہ دیکھوں

شگفتہ کی شاعری کا رنگ آج کے عہد کا رنگ ہے جس میں سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل در آئے ہیں ۔ ویسے دیکھا جائے تو آج کی شاعری انہیں حوالوں سے زندہ ہے ہاں شاعر کے اظہارِ بیان اور ان مسائل سے متاثر ہو جانے کی کیفیت اور اس کی شدت میں فرق ہوتا ہے ۔ شگفتہ نے بھی اپنے طور پر یہ کوشش کی ہے کہ وہ حقائقِ زندگی کو قاری تک پہنچا سکیں اور اس میں وہ کئی جگہوں پر کامیاب بھی ہوئی ہیں ۔

لاشیں پڑی رہیں یہاں بے گور و بے کفن بیٹے بدیس میں تھے پڑوسی غریب تھا

میں جس کو ہارنے سے بچاتی رہی سدا وہ میرے جیتنے پہ بھلا کیوں اداس ہے

جل رہا ہے چمن دھواں دیکھو ذکرِ موجِ بہار کرتے ہو

اس طرح کے اور بھی کئی اشعار اس مجموعہ سے نقل کئے جا سکتے ہیں جن سے شاعرہ کے فکری رویہ کی طرف اشارے ملتے ہیں ۔ یہ امر قابل اطمینان ہے کہ آج کی شاعری میں قاری زندگی کی تصویر دیکھ سکتا ہے اور اسے زلفِ جاناں اور معشوق کی بے وفائی سے آگے کی دنیا نظر آتی ہے ۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاعرہ نے کہیں کہیں اپنے ان جذبات کا اظہار بھی کیا ہے جن سے نسوانی درد و کرب کی نشاندہی ہوتی ہے ۔ ساتھ ہی عصری حسیت کا بھی دخل ہے ۔ لہٰذا میرے نزدیک 'غنچہ پھر لگا کھلنے' کی شاعری کیفیات، تجربات و مشاہدات کی شاعری ہے ۔

اس مجموعہ میں زبان و بیان کے حوالے سے اگر چہ کوئی بڑی بات قابل گرفت نہیں ہے مگر کئی جگہوں پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں شاعرہ نے ذرا جلد بازی سے کام لے لیا ہے وہ اس طرف اور دھیان دیتیں تو اظہارِ بیان اور خوبصورت ہو جاتا اور بامعنی بھی ۔ مثال کے طور پر ۔

دشمن ایسے بھی ہیں کچھ دوست بن کے آئیں گے غم نہ کر شگفتہ اب میں ہوں پاسباں تیرا

یہاں مصرعہ اولیٰ پر مزید توجہ درکار ہے ۔ لفظ دشمن بُری طرح دبتا ہے ۔

کتنے پیاسے ہیں شجر اور زمیں پیاسی ہے جام اک بار محبت کے پلا کر دیکھو

یہاں شجر کے حوالے سے لفظ کتنے استعمال ہوا ہے مگر زمین کی مناسبت سے کیا؟

نہ تخت و تاج کی طلب نہ موسم بہار کی جو سانس لوں تو آپ کیوں تلملانے لگتے ہیں

یہ شعر دولخت ہے ۔ پہلے مصرع میں حرص و ہوس کی بات ہے مگر اس کی مناسبت سے دوسرے مصرع میں کوئی لفظ نہیں آپایا بلکہ لفظ سانس کا استعمال ہوا ہے جس کا لحاظ پہلے مصرع میں نہیں رکھا گیا ہے ۔

مجموعہ میں پروفیسر شمیم حنفی اور ڈاکٹر امام اعظم کی آراء، ڈاکٹر منصور عمر کا طویل پیش لفظ اور

نفیس بانو شمع کا مضمون بھی شامل ہے اور ڈاکٹر طرزی کا قطعہ تاریخ بر سال طباعت تصنیف ہذا بھی۔ کتاب کا سرورق نہایت جاذب نظر ہے۔ کاغذ نفیس ہے، کمپوزنگ اور طباعت روشن۔ امید ہے کہ ادبی حلقے میں اس کتاب کی موجودگی درج ہوگی۔

نام کتاب: محمد سالم: شخص اور عکس، تالیف و ترتیب: ابوذر ہاشمی، اشاعت: ۲۰۰۲ء

قیمت: ۳۰۰ روپئے، ناشر: ہاشمی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، کولکاتا، مبصر: ڈاکٹر عبید الرحمٰن، پٹنہ۔

''محمد سالم: شخص اور عکس'' کی تالیف و ترتیب ابوذر ہاشمی نے کی ہے۔ تین سو صفحات کی اس کتاب میں محمد سالم کی شخصیت اور فن کے حوالے سے مضامین اور ان سے گفتگو کے اقتباسات شامل ہیں۔ کتاب تین ابواب عکسِ شخص، عکسِ شاعر اور عکسِ ناقد پر محیط ہے۔ اردو کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے اپنے ممدوح کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور ان کے ادبی کارناموں کا احاطہ کیا ہے ساتھ ہی محمد سالم کی کہانی ان کی زبانی بھی شامل ہے جس میں انہوں نے اپنے بچپن، اپنی تعلیم و تربیت، خاندانی پس منظر، ملازمت اور بزرگوں سے اپنے رشتے کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

محمد سالم اردو ادب میں اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور ناقد بھی۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'زاویۂ خیال' منظر عام پر آیا تو جدید شاعری کا اشاریہ، صبائے سنگ، بھی شائع ہوا۔ محمد سالم ادب و فن میں مقصدیت کو اولیت دیتے ہیں لہٰذا ایسے شخص کو نظریات اور فن سے قاری کو بھرپور طور پر متعارف کرانا ایک اچھا اور بڑا کام ہے جسے ابوذر ہاشمی نے انجام دیا ہے۔

کتاب میں شامل چند مضامین پر ایک نظر ڈالیں۔ ظفر ہاشمی کا مضمون 'محمد سالم: بیرون سے اندرون تک' ہمیں محمد سالم کی شخصیت، تنقید اور شاعری کا تفصیلی تعارف کراتا ہے۔ انیس رفیع نے اپنے مضمون 'در بنگ دِرادب اور محمد سالم' میں ادیبوں کو Neglect کئے جانے پر اپنی تشویش کا اظہار فرمایا ہے اور اسے امریکہ میں محمد سالم کی قدرشناسی کی مثال سے واضح کیا ہے۔ امام اعظم نے محمد سالم سے گفتگو کے تحت ان کی شخصیت اور ان کے اخلاق پر نہ صرف اپنا ردِ عمل ظاہر کیا ہے بلکہ گفتگو کے حوالے سے ادب کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ حامدی کاشمیری محمد سالم کو زندگی کا تحرک، طاقت اور تازگی رکھنے والے شاعر سے تعبیر کرتے ہیں تو مظہر امام ان کی آزاد غزلوں اور جدید لہجے میں شعریت اور خوش آہنگی دریافت کرتے ہیں۔ علقمہ شبلی بھی اپنے مضمون میں محمد سالم کی شاعرانہ عظمت کی طرف اشارے کرتے ہیں اور ان کی غزلیہ لفظیات و اسلوبیات کا بیان فرماتے ہیں۔ رفعت سروش نے اپنے مضمون میں محمد سالم کے تنقیدی شعور سے بحث کی ہے جو دراصل محمد سالم

کی کتاب 'نئی سمت نئے تقاضے' کا پیش لفظ ہے۔

کتاب کے دیگر قلم کاروں میں سید نہال اختر، سید احمد شمیم، صفی اختر، سلطانہ مہر، نادم بلخی، نظام صدیقی، منصور عمر، خواجہ نسیم اختر، مظفر بلخی، ایم۔ اے۔ ضیاء، نورالاسلام نشتر، ظہیر ناشاد، نوشاد احمد کریمی، قمر اشرف، شاکر خلیق، عبدالمغنی، حسین الحق، رئیس انور، مناظر عاشق ہرگانوی، طٰہٰ شمیم، مظفر مہدی، شمس فریدی، احسن شفیق، حسن امام درد، کلیم حاذق اور سرور کریم شامل ہیں۔

محمد سالم کی ایک نظم 'کون ہوگا انساں کے درد کا مسیحا بھی' کے شعری متن، فکری پیکر اور نظم میں استعمال ہونے والے مختلف جزوی اور انفرادی استعارے کا تجزیہ احمد سہیل اور ابوذر ہاشمی نے نہایت بلیغ طریقے سے کیا ہے۔

کسی بھی ادبی شخصیت کا تعارف اور اس کے فن پر بحث اپنے آپ میں ایک بڑا کام ہے حالانکہ اب یہ مضمون ہمارے بہت سے نثر نگار اور ناقد حضرات کے سامنے معمولی سا کام ہو کر رہ گیا ہے۔ شکریے کے مستحق ہیں جناب ابوذر ہاشمی جنہوں نے اس طرف نگاہ کی اور محمد سالم جیسے ادیب و شاعر کے حوالے سے اتنی اچھی کاوش کتابی شکل میں منظرِ عام پر آسکی۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے، ضخامت اور مشمولات کے پیش نظر قیمت بھی ٹھیک ہے۔ بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ یہ کاوش ادبی حلقے میں بہ نظر تحسین دیکھی جائے گی۔

نام کتاب: اعتبار نظر (تنقید)، مصنف: ڈاکٹر قاسم فریدی، صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۱۰۰ روپے اشاعت: ۲۰۰۳ء، پتہ: قاضی محلہ، اورنگ آباد (بہار)، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ۔

ادب کے سنجیدہ دانشوروں کا خیال ہے کہ ادھر کی دہائیوں میں کل وقتی اہل ناقدوں کا قحط ہے۔ بہت کم اہل نظر ناقد نظر آرہے ہیں۔ آج وہی پرانے رہنما ناقد ہیں جو تخلیق کار بھی ہیں۔ جن کی ایک بڑی فکر انگیز اور انقلاب بیں روایت بنتی ہے لیکن بدقسمتی سے گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں ابھرنے والے تخلیق کاروں تک پہنچتے پہنچتے یہ روایت منہدم ہوگئی۔ بعد کی نسلوں میں خالق فن کار ناقد پیدا نہیں ہوئے اس کی وجہ اپنی فکریات سے شدید وفاداری کام کررہی ہے۔ اسی نے ادھر کے ادیبوں اور شاعروں کی تنقید بیزاری کو پروان چڑھایا ہے۔ تخلیق کاروں کا الزام ہے کہ آج تخلیق بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ ہم مابعد جدیدت سے آگے نئے عہد کی تخلیقیت تک پہنچ چکے ہیں۔ تنقید نگار وہاں تک پہنچ نہیں پارہے ہیں۔ تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ ہم خاموش اس لئے ہیں کہ ہمارے سامنے اچھی تخلیقات کا فقدان ہے جو ہمیں لکھنے کے لئے چیلنج کرے۔ یہ سچ ہے کہ اس عہد کی تخلیقیت کے اضافی تناظر میں ہمارا ادب فکری اور عقلی افلاس کا شکار ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں مَیں نے تخلیق و تنقید کی موجودہ صورتِ حال کا اجمالی نقشہ پیش کیا

ہے اس تناظر میں مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر قاسم فریدی ایک کل وقتی ناقد اور مبصر کے روپ میں ابھرے ہیں جو صحیح معنوں میں تنقید کو تفہیم اور بصیرت کو بڑھانے کی صنف مان کر اس کے تئیں وفادار ہیں۔ تنقید کی شہرت کے بھوکے تخلیق کاروں کی قدر و منزلت کو بڑھانے کا حربہ نہ بنا کر اس صنف کو تنقیدی بے قدری اور بے توقیری سے بچا رہے ہیں۔ اس سے قبل بھی ڈاکٹر قاسم فریدی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''قصہ شناسی'' ارباب علم کو اپنی طرف متوجہ کر چکا ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ اپنی بات بڑے سلجھے ہوئے انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ بے جا تعریف و تحسین اور تنقیص سے احتراز کرتے ہیں۔

زیر نظر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اعتبارِ نظر'' دس مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں دو مضامین ایسے ہیں جن پر پیش رو نقادوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ ایک تو ''زکی انور کی افسانہ نگاری'' اور دوسرا ''رمز شعر کا دانا رمز'' دونوں مضامین بڑی جانکاہی اور تحقیقی کاوش سے لکھے گئے ہیں۔ یہ دونوں تخلیق کار مرحوم ہو چکے ہیں۔ زکی انور نے پانچ سو سے زائد افسانے لکھے ہیں لیکن بد قسمتی سے ان کے افسانوی مجموعے نایاب ہیں اسی لئے ان کا ذکر اُردو افسانے کی تاریخ میں خال خال نظر آتا ہے۔ اُن کے فن پر کوئی باضابطہ تنقیدی مضمون نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر فریدی نے دس افسانوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور مزید چودہ بہترین افسانوں کی نشاندہی کی ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ ان افسانوں کا جائزہ لے لیا جاتا کیوں کہ ان حالات میں ہمارے نقادانِ فن سے اس کی امید رکھنی فضول ہے۔ رمز عظیم آبادی اردو شاعری میں اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی مزدوری کی، مشقت اور فقر و فاقہ میں گذاری۔ پٹنہ کے ادبی حلقہ نے بھی ابتدا میں انہیں قابل اعتنا نہیں سمجھا، کلکتہ کے اشترا کی نواز حلقہ میں ان کی پذیرائی ہوئی، پروفیسر شاہدی سے شرف تلمذ حاصل ہوا اور آخر میں شعراء کی صف میں ان کی شخصیت نمایاں ہوئی ان کے مجموعۂ کلام ''نغمۂ سنگ'' اور ''شاخ زیتون'' کے حوالے سے ڈاکٹر قاسم فریدی کہتے ہیں: ''ان کے کلام کا اصل وصف یہی ہے کہ انہوں نے اپنے تجربات، خیالات اور محسوسات کو اس طرح شعری پیکر عطا کیا ہے کہ قاری ان میں مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔'' (ص:۱۲۲)

اس کے علاوہ ''اردو میں فسادات کی کہانیاں''، کرشن چندر کی کہانی پشاور ایکسپریس ''ایک جائزہ''، ''اردو شاعری اور سماجی بیداری''، ''میر کا قنوطی آہنگ''، ''اقبال کا نظریۂ خودی''، ''اختر اورینوی بحیثیت غزل گو'' کے عنوان سے مضامین کا ایک نئے انداز سے تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔

کلام حیدری کے افسانوں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ایسا بسیط معلوماتی مضمون بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ظفر حبیب ایک سلجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ ڈاکٹر فریدی نے اُن کے چند افسانوں کی بہت عمدہ تفہیم کی ہے۔ کتاب بہر صورت اہم اور قابل مطالعہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُردو شعر و ادب سے وابستہ ارباب دانش کے درمیان اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی!

راہ و رسم

☆ڈاکٹر قمر رئیس (دہلی): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ یہ شمارہ بھی پچھلے پرچوں کی طرح معلوماتی اور دلچسپ ادارتی شذرات اور نو بہ نو مضامین سے مزین ہے۔ مضامین کے انتخاب میں آپ نے تنوع کا خاص خیال رکھا ہے۔ مجھے خصوصیت سے ڈاکٹر پنہاں کا مضمون اور رالف رسل کے ساتھ ایک شام (عظیم صدیقی) پسند آئے۔ ڈاکٹر عبیدالرحمن نے ابراہیم اشک کی تازہ شرح غالب کا جائزہ خوبی سے لیا ہے۔ میں نے اشک صاحب کی کتاب حال ہی میں پڑھی ہے جو انہوں نے ممبئی کے حالیہ سفر میں بطور سوغات دی تھی۔ اس میں انہوں نے اپنے عہد کی بصیرت کے اوزاروں سے کلام غالب کے رموز کو کھولنے کی سعی بلیغ کی ہے اور اگر سب ہمیں نہیں تو اکثر اشعار کی تفہیم نو میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

☆انور شیخ (یو۔کے): ''تمثیل نو'' ملا۔ یہ نہ صرف ظاہری جاذبیت کا حامل ہے بلکہ اس کا باطنی حسن اپنی دلفریبیوں کے لئے لاجواب ہے۔ تمام لکھنے والے قابل ستائش ہیں البتہ حاجی مشرف امام صاحب خاص طور پر تحسین کے لائق ہیں جنہوں نے ''فکر اقبال پر ایک تنقیدی نظر'' کو پرکھنے میں اپنی قوت ایمانیہ کا اظہار کیا ہے۔ شائد وہ لاکھوں میں ایک ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے ایسی جرأت اور بے باکی سے نوازا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اظہار خیال کیا ہے بلکہ اپنے نقطہ نظر کے حق میں دلائل بھی پیش کئے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر آپ کی توصیف نہ کی جائے تو بے انصافی ہوگی۔ دنیائے اردو ادب میں کتنے مدیر ہیں جو جرأت اور بے باکی سے کام لیتے ہوئے ایسے نظریات کی تشہیر کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں جن سے انہیں گزند بھی پہنچ سکتا ہے؟ جب تک اُردو ادب میں آپ جیسے جرأت مند کھوئے پیدا ہوتے رہیں گے اردو ادب کی ناؤ طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ساحل مراد کی طرف بڑھتی رہے گی۔

☆مقصود الٰہی شیخ (یو۔کے): ''تمثیل نو'' موصول ہوا۔ سب سے پہلے خطوط کا حصہ زیر مطالعہ آیا۔ جناب قیصر تمکین اور محترم عنبر بہرائچی کے مکتوبات ایسے ہیں جن سے سابقہ شمارے میں شامل وقیع مضامین کی (پروفیسر حافظ شائق احمد یحیٰ کا سفرنامۂ چین اور ڈاکٹر اسرار اکبرآبادی کے مقالے پر عنبر صاحب بہرائچی کے اظہار سے بعض گوشوں کی توسیع اور نشاندہی) مزید تہیں کھلتی ہیں اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ کا ''مجھے کچھ کہنا ہے'' حسب دستور دلچسپ ہے۔ آنکھوں دیکھے حال کے سہارے بہت سے ادب دوستوں سے سنگت رہی گویا سب اپنے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے پردھان کے انتخاب کی روداد مکمل ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی خدمات زبان وادب کے علاوہ ان کا ذاتی اخلاق بھی قابل قدر، عمدہ اور بلند ہے۔ نارنگ صاحب گزشتہ دنوں دو ایک تقریبات میں شرکت کے لئے لندن آئے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم ہوا میں علیل ہوں تو فون کر کے خیریت معلوم کی۔ فرمایا قیام بڑا مختصر ہے ورنہ بریڈفورڈ آ کر مزاج پرسی کرتا۔ میرے لئے یہ ایک اعزاز کی بات ہے کہ اپنی سخت مصروفیات میں سے وقت نکال کر میرے

ایسے ایک ہمعصر سے ڈاکٹر نارنگ نے رابطہ کیا، بے نیازی نہ برتی، بیماری میں حوصلہ دیا۔ رسالے میں باقی خبریں بشمول وفیات، بھی اہم ہیں اور یہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہیں کہ اہل قلم کہیں بھی بستے ہوں ان کا جینا مرنا غفلت کا شکار نہیں ہونے دیا جاتا۔ ادیبوں سے متعلق خبروں کی ترسیل لازمی امر ہے۔ جناب رالف رسل سے جڑی یادوں پر عظیم صدیقی کی تحریر خوب ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ رسل صاحب کی شخصیت پر تھوڑا بہت اظہار کروں مگر نقاہت نے اجازت نہیں دی۔ اسرار اکبر آبادی صاحب کی ''گیتا'' پر آخری قسط بہت خاصی ہے۔ باقی (مختصر) مضامین بھی خوب ہیں۔ افسانے مجھے کچھ زیادہ نہیں بھائے۔ شاید موڈ کا اثر ہو البتہ کتابوں پر تبصرے بغور اور بڑے انہماک سے پڑھے۔ نئے رجحانات سامنے آتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کتاب پڑھنے کو دستیاب نہیں! ہے کچھ اس کا بھی علاج اے چارہ گراں؟

☆ عفت موہانی (حیدرآباد): ''تمثیل نو'' کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ بہت خوبصورت، بیحد دلکش اور انتہائی دلچسپ پرچہ ہے۔ کوئی چیز اس میں بھرتی کی اور بوجھل نہیں۔ اب مثلاً خطوں کا کالم ہے۔ کسی نے کسی دلکشی کے بغیر اپنے رسالے میں صرف مراسلات لکھا ہے، کسی نے بڑی سادگی سے آپ کے خطوط کسی نے شاعری فرمائی تو خطوں کی کہکشاں لکھ دیا، لیکن آپ ابھی نوعمر ہیں آپ کے ذہن تازہ نے ''راہ و رسم'' کے عنوان سے خط شائع کئے ہیں۔ عنوان ہی کی شگفتگی آپ کی طباعی اور انفرادیت کی مظہر ہے۔ میری طرح اوروں نے بھی اپنی اپنی جگہ کشش محسوس کی ہوگی۔ اللہ کرے کہ ''تمثیل نو'' مزید ترقی کرے۔

☆ فہیم اختر (امریکہ): ''تمثیل نو'' کا شمارہ ملا۔ رسالے کی مختلف نگارشات پڑھیں اور پڑھ رہا ہوں۔ ''وفیات'' کے زیر عنوان جون کے بارے میں پڑھ کر بہت سی یادیں تازہ ہوگئیں۔ جون سے میرا کیا اور کتنا قریبی تعلق تھا مختصراً بیان کرتا ہوں۔ جون مجھ سے تقریباً چار سال بڑے تھے۔ میری پیدائش مئی ۱۹۳۵ء ہے۔ اندازہ ہے کہ جون ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں جون کا اور میرا داخلہ امروہہ کے امام المدارس میں پہلی جماعت میں ایک ہی دن ہوا تھا۔ دو سال کے بعد میں گورنمنٹ اسکول میں تیسری جماعت میں داخل کرا دیا گیا تھا اور جون سید المدارس امروہہ میں ہی مولویت پڑھنے چلے گئے تھے۔ امروہہ میں رہائش اور دور کی عزیز داری کے باعث اکثر ملتے رہتے تھے۔ بعد میں ۱۹۴۹ء میں میں لکھنؤ چلا گیا تھا جہاں سے میٹرک، انٹر، بی کام کیا۔ اس دوران امروہہ آتا رہتا تھا مگر جون سے ملاقات کبھی کبھار ہوتی تھی اور ہم دونوں بظاہر اجنبی بنے رہتے تھے۔ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے آخر دسمبر ۱۹۵۶ء میں کراچی آ گیا تھا اور جون دو ہفتے بعد جنوری ۱۹۵۷ء کے شروع میں کراچی آئے تھے۔ دونوں وہاں اجنبی تھے اس لئے خاندانی و برادری کی تقریبات میں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ ۱۹۵۸ء میں جون نے ایک ماہنامہ رسالہ ''انشاء'' جاری کیا اور بعد میں مجھے بھی اس کے ادارے میں شامل کر لیا۔ میں جنوری ۵۷ء سے پاکستان ایئرلائن PIA میں ملازم ہو گیا تھا اور بعد میں اس کی یونین کی طرف سے اس کا ترجمان ماہنامہ ''منشور'' جاری کیا جس کا میں ہی ایڈیٹر تھا۔ اس رسالے کا نام ''منشور'' بھی جون ہی کا تجویز کردہ تھا۔ یہ

رسالہ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۳ء تک نکلتا رہا۔ ۱۹۶۲ء میں رئیس امروہوی صاحب کی بیٹی دردانہ ہاشمی کے ساتھ شادی ہوگئی اور جون میرے چچیا خسر بھی ہو گئے۔ ابتداء میں جون کا نام جون اصغر تھا ان کے والد سید شفیق حسن صاحب ایلیا تخلص کرتے تھے۔ اس کے بعد ہی جون نے اپنے نام کو جون ایلیا میں بدل لیا۔ افسوس کہ جون کی نہ صرف ازدواجی زندگی انتہائی تکلیف دہ گزری، بلکہ ان کے عزیزوں اور اکثر دوستوں نے بھی ان کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا۔ جون بلا مبالغہ پاکستان کے چند ذہین ترین اور قابل ترین افراد میں تھے۔ مجھے یہ بات تسلیم کرنے میں کسی قسم کی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میری اور دیگر احباب کی تربیت و تعلیم میں جون کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہم لوگ ان تینوں بھائیوں رئیس امروہوی، سید محمد تقی اور جون ایلیا کی صحبت میں جتنی دیر بھی بیٹھتے تھے، بہت کچھ سیکھ کر اٹھتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ''شاید'' نہ صرف کافی دنوں تک گفتگو کا موضوع بنا رہا بلکہ ان کے انتقال کے بعد گھر گھر گفتگو کا موضوع بن گیا ہے۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''یعنی'' بھی تقریباً تیار تھا۔ اس کے علاوہ خدا جانے کتنے مجموعوں کے برابر کلام لکھا پڑا ہے اور مجھے کہا جا رہا ہے مگر ان کے اصل جوہر تو ان کے انشائیوں میں کھل رہے ہیں جو وہ ''انشاء'' عالمی ڈائجسٹ اور دوسرے رسالوں میں لکھتے تھے۔ چلئے اس بہانے جون کا تھوڑا بہت قرض چکا دیا۔ لکھنے کی ہمت بھی نہیں پڑتی تھی۔

☆ سوہن راہی (یو۔ کے): ''تمثیل نو'' اپریل تا جون ۲۰۰۳ء شمارہ کچھ دن ہوئے مل گیا تھا۔ شکریہ۔ آپ کا ''مجھے کچھ کہنا ہے''، عظیم صدیقی کا ''رالف رسل: ایک یادگار شام، ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے کچھ ذاتی تاثرات، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا ایک لہر نئی اور جناب اسرار اکبرآبادی کا 'گیتا میں صحائف کے مضامین' بے حد پسند آئے۔ شعری حصہ میں مجاز جئے پوری، احمد سہیل اور انجینئر ہارون شامی کی غزلیں خوب ہیں۔ راہ و رسم کا حصہ بھی دلچسپ ہے۔

☆ گلشن کھنہ (یو۔ کے): ''تمثیل نو'' ملا۔ آپ نے بھارت۔ یو کے اور امریکا میں رہنے والے نامور قلمکاروں کی تخلیقات اس میں شامل کی ہیں۔ یہ آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں اور خوش سلیقگی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس کساد بازی اور اُردو دشمنی کے دور میں ایسا شاندار سہ ماہی رسالہ شائع کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔

☆ رشید منظر (یو۔ کے): ''تمثیل نو'' کے کئی شمارے موصول ہوئے۔ جہاں تک جریدے کی ترتیب اور تدوین کا تعلق ہے اس نے یقیناً مجھے خاصا متاثر کیا ہے۔ اسے بڑی خوبصورتی سے سجا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ''تمثیل نو'' کی ورق گردانی کے ساتھ یادوں کا ایک سمندر موجیں مارنے لگا۔ زندگی کے بہت ہی خوبصورت گزرے ہوئے دن یاد آنے لگے اور مجھے اپنا یہ شعر بار بار یاد آنے لگا......

ذہن میرا آج بھی یادوں کے گہواروں میں ہے — کٹ کے ماضی سے بھی رہ سکتا ہے اے منظر کوئی

ماضی تو پلٹ کر واپس نہیں آ سکتا، صرف اس کی یادیں ہی باقی رہ جاتی ہیں۔ میرا زیادہ تر وقت مظفر پور میں گزرا۔ دربھنگا ایک مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ذہن کے پردے پر اس کے دھندلے سے نقوش اب بھی موجود ہیں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ پچھلے سال اُردو اکیڈمی نے بہار کے نامور شاعر علامہ جمیل مظہری

کی یاد میں تقریب منعقد کی تھی جو ایک شاندار تقریب کے طور پر یاد کی جاتی رہے گی۔ علامہ یہاں کبھی نہیں آئے لیکن اب ان کا نام یہاں برابر لیا جاتا رہے گا۔

☆حباب ہاشمی (الہ آباد): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ کس اہتمام سے آپ نکالتے ہیں۔ اداریہ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے تحت ادبی وثقافتی خبریں خاصی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ ڈاکٹر نسیم اختر کے حمدیہ اشعار عمدہ ہیں۔ ڈاکٹر کلیم قیصر کی نعت پاک کا پہلا اور دوسرا شعر شانِ کبریائی کا مظہر ہے۔ میری مراد دونوں اشعار کے مصرعۂ اولیٰ سے ہے جو بجز اللہ تبارک وتعالیٰ کے کسی کے لئے زیبا نہیں ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ نعتیہ اشعار کہنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ غزلوں اور نظموں کا انتخاب خوب ہے۔ مضامین نثر بھی قابل قدر ہیں۔ ''گیتا میں صحائف کے مضامین'' کی آخری قسط اسرار اکبر آبادی کی گرانقدر کاوش ہے دیگر تخلیقات نے بھی خاصا متوجہ کیا۔

☆پروفیسر علیم اللہ حالی (گیا): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ رسالہ پابندی سے نکال رہے ہیں۔ آج کل یہ بات ایک معجزے سے کم نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ آپ اس کے معیار کی طرف بھی توجہ دے رہے ہیں اور یہ بہتر سے بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ آپ بہار سے نکلنے والے ادبی جراید کے لئے ایک مثال بنتے جا رہے ہیں۔ پیش نظر شمارے کا اداریہ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' آپ لوگوں کے سفر کی اچھی روداد ہے۔ ممبئی کی ایک مسجد کے گیٹ پر لکھی ہوئی عبارت پر آپ کی گرفت بھی پسند آئی۔ مسلمانوں کے مختلف فرقے خود آپس میں دست وگریباں ہیں تو پھر عالمی سطح پر اسلام دشمن طاقتیں جو کچھ کر رہی ہیں ان کا شکوہ کیا ہے۔ ع تباہ پھولوں کو خود ان کے رنگ وبو نے کیا۔ ادبی وثقافتی پروگرام اہم ادبی وسماجی خبریں، وفیات یہ سارے فیچر آپ خاصی محنت سے مرتب کرتے ہیں۔ آپ کا رسالہ ادب کے سنجیدہ قارئین کے لئے اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

☆شفق (سہسرام): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اس رسالے کی پہلی خوبی یہ ہے کہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ دوسرے ہر شمارہ معیار کا ایک ایک زینہ چڑھتا جا رہا ہے۔ تیسرے مضامین کا حصہ بھاری بھرکم ہوتا ہے۔ تازہ شمارے میں بھی خصوصیت سے عظیم صدیقی، حاجی مشرف امام اور اسرار اکبر آبادی کے مضامین لائق مطالعہ ہیں۔ شعری حصہ بھی جاندار ہے۔ آپ ۹۶ صفحات میں دو سو صفحات کی چیزیں سلیقہ سے سمیٹ دیتے ہیں۔ یہ خوبی کی بات ہے۔

☆صابر عظیم آبادی (کراچی): بھائی حسیر نوری کے گھر پر آپ کا رسالہ ''تمثیل نو'' پہلی مرتبہ باصرہ نواز ہوا۔ یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ دربھنگہ سے جو اُردو کے لئے سنگلاخ زمین ہی کہا جا سکتا ہے۔ ایک خوبصورت اور معیاری رسالہ ''تمثیل نو'' نکال رہے ہیں۔ ''تمثیل نو'' میں تمام مشمولات متنوع، جامع اور جاندار ہیں۔ گیٹ اپ بھی جاذب نظر ہے جس سے آپ کا علمی اور جمالیاتی ذوق نمایاں ہے۔ آپ کا اداریہ، ''نظر اپنی اپنی'' اور ''راہ ورسم'' بہت پسند آیا۔

☆ڈاکٹر عبدالمجید بیدار (حیدرآباد): ''تمثیل نو'' وصول ہوا۔ از ابتدا تا آخر سارا رسالہ دلچسپی سے بھرپور

ہے۔ آپ کے ممبئی سفر کی داستان اور انجمن باشندگان بہار ممبئی کی اعانت کے لئے مشاعرہ میں شرکت کی تفصیل بڑی پسند آئی۔ ترقی پسند تحریک کے اجلاس کی کارروائی کی تفصیلات نے ''رپورتاژ'' کوجنم دیا تھا۔ آپ نے اس صنف نثر کی یاد تازہ کردی ہے۔ جسے اُردو والوں نے ڈراما کی طرح مردہ صنف نثر بنادیا ہے۔ سادہ سرورق کے رنگ نے بھی رسالہ کو حد درجہ جاذب نظر بنادیا ہے۔ جس کے ساتھ ہی اُردو دنیا کی تمام ادبی سرگرمیوں کو جس دلچسپ انداز سے احاطہ کیا ہے۔ اس سے بہ نظر غائر تمام ادبی کارناموں سے واقفیت حاصل ہوجاتی ہے۔ طرزی صاحب نے مشاہیر ادب کی وفات پر قطعات لکھ کر اپنے صاحب طرز ہونے کا لوہا منوالیا۔ رسالہ کا شعری حصہ جس قدر وقیع ہے اتنا ہی جامع ومبسوط نثری حصہ بھی ہے۔ حمد و نعت، غزلیں ونظمیں، مضامین ومقالے، ملاقات وتاثرات کے علاوہ خطوط، کہانیاں اور افسانچے کے ساتھ ساتھ شعری تجربہ ''صنعت حرفیہ'' کی شمولیت آپ کی ادبی صحافت پر گہری نظر کا نتیجہ ہے۔ بلاشبہ گلستاں سجانے کا ہنر آپ کو خوب آتا ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے اُردو کے قلمکاروں کی تخلیقات کو یکجا کرکے آپ نے ''اُردو گاؤں'' بسادیا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اس روایت کو قائم رکھنے کی سبیل بنائے رکھے اور اس کی توسیع کے مواقع فراہم کرے۔ آمین۔ تجزیاتی اور تحقیقاتی محاکمے بھی خوب ہیں۔ آپ کا رسالہ وصول ہوتے ہی تخئیل نے جولانی دکھائی تو قلم لے کر بیٹھ گیا ہوں۔ اس قلم برداشتہ تحریر کو دوبارہ پڑھنے کی زحمت بھی نہیں کروں گا چونکہ یہ تحریر زبانِ قلم سے نہیں بلکہ روح کی گہرائی سے عود کر آئی ہے۔ خدا آپ کو اور آپ کے رسالے کو سلامت رکھے اور اسی طرح آپ سے زبان وادب کی خدمت لیتا رہے۔

☆ فرزانہ نیناں (یو۔ کے): ''تمثیل نو'' موصول ہوا۔ ماشاء اللہ یہ ایک بہت خوبصورت رسالہ ہے۔ آپ لوگوں کی کاوشیں اپنے آپ بول رہی ہیں۔ میں نے تمام صفحات بڑی دلچسپی سے پڑھے اور میرے ذوق و شوق کو اجاگر ہونے کا موقعہ ملا۔ انڈیا سے اُردو زبان میں اس قسم کی ادبی کاوشیں جاری رکھنے پر آپ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ شاعری کے حوالے سے بھی کی نظموں اور غزلیات نے محظوظ کیا، خصوصی طور پر سعید روشن صاحب اور رضوانہ پروین ارم کی غزل بہت پسند آئی جب کہ سلطانہ مہر صاحبہ کا افسانہ بھی خوب تھا۔

☆ مشتاق انجم (کولکاتا): ''تمثیل نو'' موصول ہوا۔ مکتوبات بنام ''راہ ورسم'' کافی طویل ہے مگر دلچسپی سے خالی نہیں۔ تبصرے بھی دل کو لبھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر منصور عمر، ڈاکٹر سید معصوم رضا اور آپ کی مشترکہ کوششیں لائق ستائش ہیں۔ خصوصی طور پر شمئل احمد اور شیخ صاحبان کی کتابوں پر تبصرے بہت اچھے لگے۔ مبارک ہو۔ ڈاکٹر مناظر کی ایک لہر نئی ذہن ودل میں کئی لہریں جگاتی ہیں۔ کہانیاں، مضامین، نظمیں، غزلیں سب اپنی اپنی جگہ دامن کش دل لگتی ہیں۔

☆ صوفی جمال کابری (یوپی): ''تمثیل نو'' موصول ہوا۔ واقعی آپ شمارے کو روز بہ روز معیاری اور خوبصورت بناتے جارہے ہیں۔ دنیا عمل کی جگہ ہے اور جس کا عمل جتنا ہوگا اور جتنا خوبصورت ہوگا کامیابی اس کے حصے میں آئے گی۔ آج یہی وجہ ہے کہ ''تمثیل نو'' ملک کے باہر بھی بے حد پسند کیا جارہا ہے۔ اس

شمارے میں محترمہ ڈاکٹر پنہاں صاحبہ (امریکہ) کا تحریر کردہ مضمون بعنوان ''گویم وگرنہ گویم مشکل'' دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔

☆ احمد سہیل (امریکہ): ''تمثیل نو'' مل گیا۔ بہر حال پرچہ خوب جارہا ہے۔ مضامین کا حصہ پر فکر ہی نہیں ...... روایت اور جدیدپن کا خوبصورت امتزاج ہے اور عصری ادبی سرگرمیوں سے آگہی بھی ہوتی ہے۔ اس مختصر سے پرچے میں اتنی اچھی اور کارآمد تحریریں پاکر دل خوش ہوجاتا ہے اور پرچے کا انتظار ہی رہتا ہے۔

☆ ڈاکٹر حنیف ترین (سعودی عربیہ): ''تمثیل نو'' ملا۔ آپ کا پرچہ حقیقت میں تمام دوسرے پرچوں سے اپنے Contents کی وجہ سے بالکل ہی مختلف ہے۔ ہر طرح کے مواد سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری پرچے کو اور زیادہ مزے لے لے پڑھتا ہے۔ آپ نے محترمی گوپی چند نارنگ صاحب کے ساہتیہ اکیڈمی کے چیئر مین بننے پر جو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس میں میں بھی شامل ہوں وہ نہ صرف محقق، ادیب، تنقید نگار وغیرہ وغیرہ ہونے کے علاوہ ایک زبردست منتظم ہیں اور ان کی یہ خصوصیت ساہتیہ اکیڈمی میں بہت سی خوش کن تبدیلیوں کا باعث بھی ہوسکتی ہے۔ بہر حال مجھے تو سب سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ اُردو ادب سے متعلق کوئی پہلا شخص ہے جو ملک میں اس کرسی پر بیٹھ گیا ہے۔ میں انہیں مدتوں سے جانتا ہوں! ان سے قربت ہے اس لئے مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ نہ پوچھیں۔ اس شمارے میں، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون ''ایک لہر نئی۔ ۹'' میں وہ ٹھیک فرمارہے ہیں کہ خالی برتن ہی صدا دیتے ہیں...... عبدالمنان طرزی تو کمال پر کمال کررہے ہیں اب ''صنعتِ حرفیہ'' اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ جناب ڈاکٹر مجید بیدار کا مضمون جس کی دوسری قسط اس شمارے میں شامل ہے بیحد معلوماتی ہے اور اس طرح مضامین آپ شامل کرکے بہت ہی اچھا کرتے ہیں۔ اس شمارے میں جناب باقر مہدی نے حنا ضیا شیخ کی نظم کا جو ترجمہ کیا وہ خوب تر ہے اسی طرح جناب علیم صبا نویدی کی نظم بھی خوبصورت ہے جب کہ تمام نظمیں اور غزلیں نہایت عمدہ ہیں وہیں پر اوم کرشن راحت صاحب کی پوری غزل مرصع ہے اور پڑھ کر مزہ آگیا۔ تمام کتب پر کیا خوب تبصرے آپ نے اس شمارے میں شامل کئے ہیں۔

☆ سید ہاشم رضا (بتیا): دربھنگہ میں کافی عرصہ کے بعد تم سے ملاقات ہوئی تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی کوئی تبدیلی نہیں پایا نہ جسمانی نہ اخلاقی۔ تم نے دربھنگہ میں اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ اخبار میں برابر دیکھتا رہتا ہوں۔ تمثیل نو کو دیکھ کر تمہاری ادبی صلاحیت کا روشن پہلو سامنے آگیا۔ تمہاری محنت اور صلاحیت سے یہ رسالہ ملک کے ادبی حلقہ میں یقیناً اپنی جگہ بنائے گا۔ میں نے دربھنگہ میں کئی بار پڑھا بہت اچھا اور معیاری لگا جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء کے ''تمثیل نو'' میں برادر محترم ڈاکٹر قاضی انصار الحق کے منظوم تاثرات ''رفتگاں وقائماں'' کئی بار پڑھنے پر بھی تشنگی باقی رہی طرزی صاحب کی منظوم تاریخ میں نے نہیں دیکھی ہے۔ لیکن یہ تاثر ہی پڑھ کر پوری داستان کا خاکہ آنکھوں کے سامنے آگیا بہت ہی قابل قدر ہے۔ افسانچے میں سہیل جامعی کی ''سچائی'' اور حسن مثنیٰ کے ''مرض'' سے کافی متاثر ہوا۔

☆ شارق عدیل (ایٹہ): اس بار ''تمثیل نو'' میں آپ نے مکتوبات خاصی تعداد میں شائع فرمائے ہیں ان

میں کچھ خطوط اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاصی اہمیت رکھتے ہیں مثلاً اندر سنگھ ورما کا خط اپنے اندر کئی کڑوی حقیقتیں سموئے ہوئے ہے۔ جن سے انکار ممکن نظر نہیں آتا۔ موصوف اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں ''اپنے ہی ملک کے ایک صوبہ میں گذشتہ برپا کی گئی قیامت صغرہ کا نقشہ کیا معدوم ہوگیا ہے؟ گجرات فسادات کے بعد گورو یاترا اور الیکشن میں ظالم حکومت کی واپسی نے بہت کچھ واضح کردیا ہے۔ شاعر و ادیب و دانشور ایسے لفظ اس دور میں کوئی معنویت نہیں رکھتے ہیں۔ چند روپے کی خاطر سب سیاسی پتنگیں اڑا رہے ہیں۔''

☆ مدیر 'سنگ تراش' (حیدرآباد): ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے زیر عنوان پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ادبی کامنٹری سن رہا ہوں۔ ادبی سرگرمیوں کی ادبی رپورٹس بھی خوب ہیں۔ ادبی و ثقافتی پروگرام کی رپورٹنگ اچھے انداز میں کی گئی ہے۔ کچھ اہم خبروں اور وفیات کے الگ شعبے میں منقسم ہیں۔ ڈاکٹر پنہاں کا گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کا انداز بیان اپنی شناخت آپ ہے۔ فکر اقبال پر تنقیدی جائزہ خوب ہے۔ نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی طرز زندگی کے قصے جلدوں میں محفوظ ہیں جو ہمارے ہی حیدرآباد ریاست کے حکمراں تھے جن کی سیکولر حکمرانی بے مثال تھی وہ ہندو اور مسلمانوں کو اپنی دو آنکھوں سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ اگر قسط اول کی زیراکس کاپی آپ بھیج سکیں تو ہم آپ کے بے حد مشکور ہوں گے۔ ''سکے کے دو رخ'' اور حنیف ترین صاحب کی غزلیں بھی معقول ہیں۔ منظر شہاب، مسلم شہزاد، فرزانہ بیناں، طیب واسطی، حنا فیضی کی غزلیں پسند آئیں۔ محسن زیدی اور سرفراز اشہر کی غزلیں بھی دل کی گہرائیوں میں اترتی ہیں۔

☆ تاج ہاشمی (بسنت، دربھنگہ): ''تمثیل نو'' دستیاب ہوا۔ مثل مشہور ہے کہ ''سفر وسیلۂ ظفر'' آپ نے سفر ممبئی کی روداد نہایت خوبصورت الفاظ اور دلنشیں پیرائے میں قلمبند کی ہے، جس سے کوئی بھی محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس شمارے کے جملہ مشمولات نثر و نظم اعلیٰ پائے کے معیاری ہیں۔ جاوید اختر چودھری کا افسانہ ''تھکاوٹ'' بہت خوب معلوم ہوا۔ کتابوں پر تبصرے کا حصہ ادبی تناظر میں قدر اوّل کا حامل ہوتا ہے۔ کتابوں کا تعارف اور ان کی تعیین قدر کا محاسبہ وسیع اور ہمہ گیر مطالعے کا متقاضی ہے۔ ڈاکٹر منصور عمر اور ڈاکٹر امام اعظم صاحبان کے تبصرے فنی اور تخلیقی سطح پر پورے اترتے ہیں اور مستقل تنقیدی مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نقد و نظر کے بصیرت افروز نکات سے کماحقہٗ آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ عبدالمنان طرزی صاحب کے ''صنعت حرفیہ'' کے ضمن میں عرض ہے کہ الف ممدودہ کے معاملے میں ایک کے بجائے دو الف کا التزام تو شچی عندیے کو تکمیلیت سے ہم آہنگ کردے گا۔ یعنی (ا+ا+غ+ا=آغا) اس کا اطلاق حرف مشدّد پر بھی ہونا چاہئے۔

☆ سراج انور مصطفےٰ آبادی (مہاراشٹر): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ دیدہ زیب اور خوش نظر ہے۔ حمد و نعت (نسیم اختر اور ڈاکٹر کلیم قیصر) بہت خوب ہیں۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' میں آپ نے اپنے ممبئی کے سفر اور مشاعرے کی روداد بہت اچھے انداز میں پیش کی ہے۔ رالف رسل سے ملاقات عظیم صدیقی نے نہال صاحب کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ مشمولات نثر و نظم معیاری ہیں اور رسالہ خوب سے خوب تر کی منزل طے کررہا ہے۔

☆ ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم (جمشید پور): ''تمثیل نو'' موصول ہوا۔ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کے قطعات

کیا کہنے ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے اداریہ بے حد پسند آیا۔ تمام علمی وادبی اور ثقافتی معلومات فراہم کر کے ہماری اور ادب کی ضرورت کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہارون شامی، محسن زیدی، گلشن کھنہ، شبینہ نوشاد، ایم۔اے۔ضیا، ڈاکٹر افضال فردوس پادری، سعید روشن، فرزانہ نیناں غرض کہ غزلیات کا حصہ بے حد عمدہ ہے۔ نظمیں بھی دل کو کھینچتی ہیں۔ آپ کی یہ ادبی کاوش قابل ستائش ہیں۔

☆ ڈاکٹر تعظیم احمد کاظمی، ہریہر پوری: آج کے اس دور میں جبکہ ہر چہار جانب سے اردو پر ظلمتوں کے پہاڑ ٹوٹتے جا رہے ہیں ایسے میں اتنا شاندار انداز بڑی ہی حیرت کی بات ہے۔ ادبی پرچہ نکالنا تو جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ایسے پر آشوب دور میں جبکہ جنسی تلذذ سے بھرپور میگزن اپنا کمال دکھا رہے ہیں اور لوگوں کے اذہان پراگندہ کر رہے ہیں ایسے میں کسی خالص ادبی پرچہ نکالنے کی سوچنا بھی گناہ عظیم سے کم نہیں۔ یہ تو بھئی سرتاسر گھاٹے کا سودا ہے۔ بس اتنا ہی کہوں گا کہ اعظم نے عظیم کارنامہ انجام دے کر ادبی جریدوں کی دنیا کا خود کو امام بنا لیا ہے اور تمثیل نو کی ایک ایسی لافانی دنیا تیار کر ڈالی ہے جو اس کی انفرادیت کو ہمیشہ چار چاند لگائے رکھے گی۔

☆ عبدالحق امام (گورکھپور): ''تمثیل نو'' موصول ہوا۔ آپ کا اداریہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی جس میں آپ نے اپنے سفر ممبئی کا بھی ذکر کیا ہے۔ سرورق سے لے کر مضامین نثر و نظم میں تنوع اور تبصروں میں معروضیت پسندی خوش سلیقگی کی ضامن ہے۔

☆ خالد عبادی (نئی دہلی): ''تمثیل نو'' موصول ہوا۔ اداریہ (مجھے کچھ کہنا ہے) میں آپ نے انجمن باشندگان بہار کے مشاعرے میں شرکت کے حوالے سے ممبئی کے سفر کا حال احوال بڑے ہی خوبصورت پیرائے میں رقم کر دیا ہے۔ جس سے دلدادگان ادب کے تئیں آپ کی نیک خواہشات اور پرخلوص عزائم کا پتہ چلتا ہے۔ تنوع اور ہمہ جہتی تمثیل نو کی خاص پہچان ہے۔

☆ ڈاکٹر منظر حسین (رانچی): ''تمثیل نو'' شمارہ ۸ موصول ہوا۔ تمام مشمولات کافی پسند آئے۔ خصوصاً کلچرل اور لٹریری ایکسچینج کے لئے جو آپ نے بات اٹھائی ہے وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ آپ کے اداریے کے اس جملے نے کافی متاثر کیا ''سیاسی حکمت عملی کو اپنانا تو دنیا کے سیاسی رہنماؤں کا کام ہے لیکن سیاست کو عالمی سطح پر عالم انسانیت کے لئے کارگر بنانا دانشوروں اور شاعروں کی ذمہ داری ہے۔'' کاش ہمارے دانشور اور فنکار اس جہت سے بھی سوچتے۔ پروفیسر حافظ شائق احمد یحیٰی کا سفرنامہ کافی معلوماتی ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے کلام کے سلسلے میں پروفیسر شکیل الرحمٰن کا مضمون اسرار اکبر آبادی کا مقالہ ''گیتا میں صحائف کے مضامین'' کافی علمی انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ عفت موہانی کی کہانی ''تعبیر'' اقبال انصاری کا افسانہ ''گنہگار'' نے ذہن کو متاثر کیا۔ سہیل جامعی کے افسانچے بھی خوب ہیں۔ شعری حصے میں جگن ناتھ آزاد، منظر شہاب، علیم اللہ حالی، حباب ہاشمی وغیرہ کی غزلیں کافی پسند آئیں۔ آپ رسالہ نہایت لگن سے نکال رہے ہیں۔ ہر نیا شمارہ ایک نئے معیار سے سامنے آ رہا ہے۔

☆ قیصر اقبال (مونگیر): پروفیسر اقبال حسن آزاد کے توسط سے ''تمثیل نو'' شمارہ ۸ بغرض مطالعہ ملا۔ شاندار

خوبصورت طباعت، بہترین کاغذ کے ساتھ یہ رسالہ سامنے آیا ہے۔ شعری حصہ معیاری اور get-up باوزن ہے۔ افسانے دلچسپ اور عصری آگہی پر مبنی ہیں۔ عالمی اور آفاقی صورت حال پر آپ کا اداریہ بھرپور ہے۔ ادبی اور ثقافتی تقاریب سے متعلق خبریں بہت کچھ بہم پہنچاتی ہیں۔

☆ بلال غزالی (سعودی عربیہ): ''تمثیل نو'' شمارہ ۸ موصول ہوا۔ لیکن بے حد تاخیر سے۔ گوکہ ہمیشہ وقت پر مل جایا کرتا ہے۔ شائد اس دفعہ جنگ عراق دوئم کی افراتفری کی وجہ کر ایسا ہوا ہو۔ بہر کیف ہر شمارہ عمدگی کی طرف رواں دواں ہے اور یہ آپ کے سچے لگن کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر مجید بیدار کی تحقیق کا سلسلہ دکن اُردو اسکول کو سمجھنے کی ایک اچھی کڑی ہے۔ ڈاکٹر شائق احمد یحییٰ کا سفرنامہ چین بہت خوب ہے۔ ہمیشہ کی طرح آپ نے ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے بجائے بہت کچھ کہا ہے۔ ضرورت ہے اس پر عمل کیا جائے۔ اُردو زبان کی بقا اور ترقی کے لئے ''راہ و رسم'' کے معرفت محترمہ عفت موہانی، نارنگ ساقی، نجم عثمانی و محترمہ حلیمہ سعدیہ شگفتہ کے خیالات قابل فکر ہیں۔ جناب انڈریو ڈیلی جو کہ عالمی ماہر لسانیات ہیں کے مطابق دنیا میں ہر سال تقریباً ۲۵ زبانیں مردہ یا متروک ہو جاتی ہیں۔ ہالینڈ میں قائم Department for language Psychology اس سلسلہ میں کافی اہم کام انجام دے رہی ہے۔ اسی ادارہ کی تحقیق کے مطابق آنے والے پچاس برسوں میں دنیا میں بولی جانے والی کم و بیش چھ ہزار زبانوں میں سے صرف ایک ہزار زبانیں انگریزی زبان کا مقابلہ کرتے کرتے کسی طرح زندہ رہ پائیں گی۔ گو کہ اردو کو فی الحال اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس نوعیت کا خطرہ ہے۔ کیوں کہ ہندو پاک کے علاوہ برطانیہ، یورپ، امریکہ کے علاوہ خلیج عرب میں آباد لاکھوں لوگوں کی زبان اردو ہے مگر اس شیریں زبان اردو کو اپنے جنم بھومی میں ہی سنگین خطرہ ہے۔ عالمی تجارتی منڈی کی مقبول انگریزی زبان اور گلوبلائزیشن کی وجہ کر انگریزی زبان سے اردو کو اتنا خطرہ نہیں جتنا حکومت ہند کی جانبدارانہ اور غلط تعلیمی پالیسیوں سے ہے جو اردو ہندی سگی بہن کو سوتن بنا کر پیش کر رہی ہے۔ جو اپنا قد اونچا کرنے کے بجائے دوسروں کے قد کاٹ کر خوش ہوتی ہے۔ آج فراق گورکھپوری کی آتما بھی گہرے دکھ میں ہوگی۔

R. No: 21523/22/AL/TC/88
Rs. 15/-
Quarterly TAMSEEL-E-NAU
July - September 2003
Ph : 06272-35117
Vol. : 3, Issue : 10
Editor : Dr. IMAM AZAM
Qilaghat, Darbhanga - 846004 (Bihar)